چیزوں کی کہانیاں
آصف فرخی

چیزوں کی کہانیاں

آصف فرخی

مکتبہ پیامِ تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

تقسیم کار

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی 110006
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی 400003
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ 202002

پہلی بار: دسمبر ۱۹۹۳ء　　تعداد 1000　　قیمت: 7/50

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس۔ دریا گنج۔ نئی دہلی میں طبع ہوئی۔

فہرست

پیش لفظ

صبح سویرے جب آپ اُٹھتے ہیں تو صابن اور پانی سے ہاتھ مُنہ دھوتے ہیں، برش یا مسواک سے دانت مانجھتے ہیں، اور کنگھے سے بال بناتے ہیں۔

کھانے کے وقت میز کے سامنے کرسی رکھ کر بیٹھ جاتے ہیں، ضرورت پڑنے پر چمچہ استعمال کرتے ہیں۔ جو کھانا آپ کھاتے ہیں، چولھے پر پکتا ہے اور پکنے کے بعد برتنوں میں آپ کے سامنے لایا جاتا ہے۔ ڈونگے سے رکابی میں کھانا نکالتے ہیں، پھر اطمینان سے کھاتے ہیں۔

جب اندھیرا ہو جاتا ہے تو آپ بتّی جلا دیتے ہیں۔ گرمی لگتی ہے تو پنکھے کی رفتار تیز کر دیتے ہیں۔

جب گھڑی بتاتی ہے کہ سونے کا وقت ہو گیا، تو آپ کپڑے بدلتے ہیں، لیٹنے کی تیاری کرتے ہیں اور پلنگ پر لیٹ کر گہری نیند سو جاتے ہیں۔

صابن اور پانی، برش، مسواک، کنگھا، کرسی اور میز، چھری اور چمچہ، بتّی اور کنگھا، گھڑی اور پلنگ — ہم صبح سے لے کر رات تک کتنی بہت سی چیزوں کو استعمال کرتے ہیں۔ یہ چیزیں اب ہماری زندگی کا حصّہ بن گئی ہیں کہ ہم ان کے بارے میں غور بھی نہیں کرتے۔

مگر ایک زمانہ ایسا تھا جب لوگوں کو اس طرح کی بس تھوڑی سی سہولتوں کے ساتھ گزارہ کرنا پڑتا تھا اور اس سے پہلے ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب اِن میں سے کوئی بھی سہولت موجود نہیں تھی۔

اُس وقت ہر آدمی کو سخت گیر فطرت کے خلاف جدّوجہد کرنی پڑتی

تھی اور زندہ رہنا اسی جدّوجہد کا نام تھا۔ اپنے ذہن کو استعمال کر کے آدمی نے رفتہ رفتہ اپنے روز و شب کو آسان بنا لیا۔ اس نے موسم کی سختی پر قابو پانے کے طریقے ڈھونڈے، کام آسان بنانے کے لیے اوزار ڈھالے۔
جوں جوں وقت گزرتا گیا، لوگوں نے زندگی کو سہل اور آسان بنانے کے نت نئے طریقے ڈھونڈ لیے۔ انھوں نے مٹّی سے برتن بنائے جس میں کھانا پکا سکیں اور پکا ہوا کھانا رکھ سکیں۔ بیٹھنے کے لیے کرسی اور لیٹنے کے لیے پلنگ بنائے۔ طرح طرح کی میزیں بنائیں۔ گھروں کی اور سامان کی حفاظت کے لیے تالے بنائے اور تالے کھولنے کے لیے چابیاں۔ وقت کا دھیان رکھنے کے لیے گھڑی ایجاد کی اور وقت کے بہتر استعمال کے لیے کاغذ، قلم اور کتاب۔

لیکن یہ ساری چیزیں ایک دن میں حاصل نہیں ہوگئیں۔ چیزیں بھی لوگوں کی طرح بڑھتی اور بدلتی رہتی ہیں۔ اس کتاب میں چیزوں کی یہی کہانی بیان کی گئی ہے۔

پرانے زمانے کے لوگوں کے برخلاف، آج کا انسان اپنی زندگی کا ایک دن گزارنے کے لیے کتنی ساری چیزیں استعمال کرتا ہے۔ ہم ان چیزوں کی سہولت کے عادی ہوگئے ہیں۔ لیکن یہ چیزیں ہمیشہ سے موجود نہیں تھیں۔ انسان کو اپنی ضرورت کے لیے چیزوں کو ایجاد کرنا پڑا۔

چیزوں کی یہ کہانی بتاتی ہے کہ مختلف زمانوں میں انسان نے کیسے اِن چیزوں کو بنایا اور تبدیل کیا۔ مختلف ملکوں اور مختلف زمانوں سے ہوتی ہوئی چیزیں آخر اس شکل میں کیسے پہنچیں جس سے ہم مانوس ہیں۔

چیزوں کی کہانی کا یہ بنیادی خیال جرمن نژاد مصنّف فرینک جوپو کی ایک کتاب سے ماخوذ ہے۔ یہ کتاب بڑی دلچسپ اور معلوماتی ہے

اس کتاب میں یورپ اور امریکہ کے معاشرے کا ذکر زیادہ ہے مجھے یہ مناسب معلوم ہوا کہ اس کے ترجمے کے ساتھ ساتھ اس کتاب میں اپنے معاشرے اور اپنی تہذیب کا حوالہ شامل کیا جائے جس طرح چیزیں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ کر بدل جاتی ہیں اور لوگوں کی ضرورت کے مطابق ڈھل جاتی ہیں، اسی طرح چیزوں کی کہانی میں بھی تبدیلیاں اور اضافے کر کے پیش کیا جا رہا ہے۔ پرانے زمانے میں ہمارے ہاں جس طرح کی چیزیں استعمال میں آتی تھیں اور جو قاعدے قرینے برتے جاتے تھے، اس کے بارے میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی کتاب "ہندستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے" سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اردو کی بعض کلاسیکی کتابوں کے حوالے بھی دیے گئے ہیں تاکہ پڑھنے والوں کے سامنے ایک مکمل تصویر آ جائے۔

چیزوں کی کہانی سے ایک بات بہت واضح ہوتی ہے کہ اس کہانی کے ذریعے ہم تہذیب کے عمل سے واقف ہو سکتے ہیں۔ چیزوں کی بدلتی ہوئی شکلیں ہمیں تہذیب کی کہانی سناتی ہیں اور یہ بتاتی ہیں کہ ہماری ثقافت میں کس طرح کی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ اگر ہم غور سے دیکھیں تو ہمارے اردگرد کی چیزیں ہمیں بتا رہی ہیں کہ ہم کون ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔

آج کی پوری دنیا میں بڑی تیزی سے تبدیلیاں ہو رہی ہیں، اور ہمارا معاشرہ خاص طور پر بہت سی تبدیلیوں کی زد پر ہے۔ ان تبدیلیوں کی رفتار پرانے معاشرے کے مقابلے میں زیادہ تیز ہے۔ اس کی ایک مثال دیکھیے۔ محمد حسین آزاد نے اپنی مشہور کتاب "آبِ حیات" میں حضرت امیر خسرو کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک کوچے میں گزر ہوا جہاں ایک دکان میں دُھنیا روئی دُھنک رہا تھا۔ کسی نے کہا کہ سارے دُھنیے ایک ہی انداز پر روئی دُھنکتے ہیں۔ امیر خسروؔ نے اس آواز کو الفاظ میں

یوں بیان کیا ۔ "درپئے جاناں جاں ہم رفت ۔ جاں ہم رفت ۔ جاں ہم رفت
رفت رفت، ایں ہم رفت و آں ہم رفت ۔" ایں ہم ۔ ایں ہم ۔ رفتن ۔
رفتن ۔ وغیرہ ۔ یہ روئی دھننے والا جو امیر خسروؒ کے زمانے میں موجود
تھا ۔ آزاد کے زمانے میں بھی موجود رہا ۔ میں نے اپنے بچپن میں
بھی اس کی آواز سنی ہے ۔ لیکن اب ایک دم سے وہ غائب ہوگیا ۔
اور اس کی آواز سنائی نہیں دیتی ۔ خسروؒ کے زمانے سے لے کر
اب سے چند برس پہلے تک، کوئی ساڑھے سات سو برس کا فاصلہ
ہے ۔ اس آواز نے ساڑھے سات سو برس تو پار کر لیے ۔ مگر ادھر چند
برسوں کے اندر رہی اندر اس طرح غائب ہو رہی ہے کہ آئندہ چند
برسوں میں جو بچے بڑے ہوں گے، انھیں امیر خسروؒ کے جواب کا
مطلب کسی سے پوچھنا پڑے گا ۔ صدیوں کے فاصلے، چند برسوں
میں طے ہوئے جا رہے ہیں ۔ ہم بعض چیزوں کو دقیانوسی قرار
دے کر برا سمجھنے لگے ہیں اور بعض چیزوں کے استعمال کو بہت اچھا
سمجھتے ہیں ۔ چیزوں کی شکلیں پہلے بھی بدلی ہیں اور آیندہ بھی بدلتی
رہیں گی ۔ جو کل تھا وہ آج نہیں ہے اور جو آج ہے وہ آیندہ
نہ ہوگا ۔ اس تبدیلی سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اسے
سمجھنے کی ضرورت ہے ۔ اگر ہم غور کریں تو چیزوں کی کہانی ہمیں بھولا
ہوا سبق سکھلا سکتی ہے ۔

ہم چیزوں کا استعمال تو بہت کرتے ہیں اور ان کی آسایش کے
عادی ہوگئے ہیں، لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہمارا معاشرہ چیزیں
حاصل کرنے پر بہت زور دیتا ہے لیکن چیزوں کی قدر نہیں کرتا ۔
اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ چیزیں کتنے طویل سفر کے بعد ہم تک
پہنچی ہیں تو شاید ہم ان کو بہتر طور پر سمجھ بھی سکیں اور ان سے

اپنے تعلق کو پہچاننے لگیں۔ اس کتاب کی تالیف کا ایک مقصد یہ بھی ہے۔

اس کتاب کا منصوبہ کافی دنوں سے میرے ذہن میں تھا۔ اس کو مکمل کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میرے عزیز دوست طاہر مسعود نے اس کی اشاعت سے دلچسپی ظاہر کی اور اسے اپنے رسالے "آنکھ مچولی" میں شائع کیا، اور بچوں نے اسے خاصا پسند کیا۔ اب یہ کتابی صورت میں شائع ہو رہی ہے تو اس کتاب کو جناب طاہر مسعود کے نام معنون کرنا چاہتا ہوں۔

آصف فرّخی

بتّی

ابتدا میں، سورج اور چاند اور ستارے، انسان کے لیے روشنی کا واحد ذریعہ تھے۔ جب اندھیرا ہو جاتا تو لوگ جو بھی کام کر رہے ہوتے اسے چھوڑ دیتے اور سونے کی تیاری کرنے لگتے۔ اس وقت روشنی محدود تھی، اندھیرا بہت خوف ناک اور طاقت ور تھا۔

دھیرے دھیرے یہ اندازہ ہوا کہ آگ جلانے سے اندھیرے کو فرو کیا جا سکتا ہے۔ جلتی ہوئی لکڑی کے ذریعے روشنی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ بھی لے جایا جا سکتا تھا۔ اندھیرا کونے کھدروں میں سمٹنے لگا۔ سرو کی لکڑی یا چربی میں ڈبوئے ہوئے سینٹھے سے بنائی ہوئی مشعل زیادہ دیر تک جلتی تھی اور اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے میں انگلیوں کی پوریں جلنے کا خطرہ نہیں تھا۔

دھڑ دھڑ جلتی ہوئی مشعلیں لے کر انسان اندھیرے کی نامعلوم سلطنت فتح کرنے نکلا۔ اب دنیا اس کے سامنے روزِ روشن تھی۔

روشنی کے لیے چراغ سب سے بہتر تھا۔ یہ پتّھر کے دور کے کسی آدمی کی ایجاد ہے۔ پہلا چراغ بس اتنا سا تھا کہ کھوکھلے پتّھر یا مٹّی کے پیالے میں چربی بھر دی گئی۔ اسے کہیں بھی رکھا جا سکتا تھا اور خالی ہو جانے پر دوبارہ بھرا جا سکتا تھا۔ اب روشنی انسان کے اختیار میں آ گئی تھی۔

دھات اور چینی کے بنے ہوئے چراغ قدیم یونانیوں اور رومیوں

کے گھر میں روشنی کرتے تھے۔ وہ لوگ چراغ جلانے کے لیے تیل کا استعمال کرتے تھے اور چراغ میں بتی ڈالتے تھے جس سے دھواں کم اُٹھتا تھا اور شعلہ بھڑکتا کم تھا، جس کی وجہ سے روشنی مستحکم ہوتی تھی۔

رومیوں سے بہت پہلے، قدیم چین کے باشندوں نے لالٹین بنالی تھی جسے گھر کے باہر بھی استعمال کیا جا سکتا تھا۔ روشنی کی لو موسم اور تیز ہوا سے محفوظ تھی اور لالٹین کے اندر سے چھَن چھَن کر آتی تھی۔ چینیوں نے خوبصورت نقش و نگار کے ساتھ لالٹین کو بہت دلکش بنا دیا۔ لالٹین کی صورت میں روشنی کو ایک گھر مل گیا۔

نئے سال کی آمد اور دوسرے تہواروں پر وہاں اب بھی لالٹین روشن کی جاتی ہیں، اور گھروں میں لٹکائی جاتی ہیں۔

جن علاقوں میں تیل آسانی سے نہیں ملتا تھا۔ وہاں لوگ روشنی کے لیے دوسرے ذرائع پر انحصار کرتے تھے۔ پرانے زمانے کے محل اور قلعے قندیل اور مشعل سے روشن ہوتے تھے۔ یورپ کے محلات میں ایسی ٹوکریاں رکھی جاتی تھیں جن میں آگ جلائی جاتی تھی۔

گھروں کے باہر جانے کے لیے لالٹین بہت مفید ثابت ہوئی۔ بڑے بڑے شہروں میں خاص مقامات پر آگ کی ٹوکریاں رکھی جانے لگیں تاکہ جو لوگ اندھیرے کے وقت چل پھر رہے ہیں انھیں مشکل نہ ہو۔ امیر لوگ اندھیرے میں راستہ دکھانے کے لیے بچّوں کو ملازم رکھتے تھے جو جلتی ہوئی رسّی کی مشعل لے کر ان کے آگے آگے چلتے تھے۔ ایک بچّہ چلتے چلتے تھک جاتا تو وہ روشنی دوسرے بچّے کو تھما دیتا اور یوں روشنی کا ایک سلسلہ بن جاتا۔

شہد کی مکھیوں کے جمع کیے ہوئے موم کو جلا کر روشنی کرنے کا طریقہ قدیم روم کے زمانے میں بھی دریافت ہو چکا تھا۔ لیکن شمع کا رواج اس وقت عام ہوا جب چربی کی صورت میں موم کا سستا مترادف مل گیا۔ پگھلی ہوئی

چربی کی شمعوں کا رواج بہت عرصے تک عام رہا۔

شمع کے عروج کے زمانے میں چراغ بھی جلتا رہا۔ تیل کے دیے اور چراغ آج تک باقی ہیں۔ اٹھارویں صدی میں چراغ کو ایک نئی شکل اُس وقت مل گئی جب اُس میں مٹّی کا تیل جلایا جانے لگا۔ بعد میں اُس کے چاروں طرف شیشے کی نلکی اور بغیر دھویں کی بتّی لگادی گئی۔ یوں وہ پہلی مصنوعی روشنی تیّار ہوئی جس کا شعلہ خوب روشن تھا اور بغیر کسی بُو کے جلتا تھا۔

اٹھارویں صدی میں گیس لیمپ کو فروغ حاصل ہوا اِن کا رواج انگلستان میں ہوا اور پچھلی صدی کے آخر میں نیویارک شہر کی سڑکوں پر گیس لیمپ نصب کر دیے گئے۔ گیس کی روشنی نے دنیا کے بڑے بڑے شہروں کو روشنی کے شہر بنا دیا۔

گیس کا چراغ اس وقت گُل ہو گیا جب بجلی کی روشنی دریافت ہو گئی۔ تھامس ایڈیسن نے ایسا بلب ایجاد کیا جو تار کی مدد سے اور شعلے کے بغیر جلتا تھا، روشنی دیتا تھا۔

بجلی کے بلب کے سامنے چراغ اور لالٹین سب کی روشنی ماند پڑ گئی۔ گھر اور کارخانے جگمگا اُٹھے۔ رات میں دن کا سماں ہو گیا۔ جدھر دیکھیے اُجالے ہی اُجالے ہیں۔

زیادہ عرصہ نہیں گزرا، سائنس داں جو ابھی تک بہتر روشنی کی تلاش میں سرگرداں ہیں، ایک اور حیرت انگیز دریافت سامنے لے کر آئے۔ یہ فلوریسنٹ روشنی ہے FLUORESCENT شیشے کی سیل بند نلکی میں روشنی چھوڑنے والا ایک مادّہ ہے جو برقی رو سے منوّر ہو جاتا ہے اور پھر بہت عرصے تک جل سکتا ہے۔

ایک چھوٹا سا کھٹکا دبانے سے آج کا انسان رات کو دن اور اندھیرے کو اُجالا بنا سکتا ہے۔ "تاریکی کو دفع کرنے کے لیے روشنیاں ہی روشنیاں

ہیں۔ علامہ اقبالؔ نے لکھا تھا:

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم

(تو نے رات بنائی، میں نے چراغ بنایا)

یہ چراغ انسان کی تلاش کا ایک کارنامہ ہے۔ چھوٹا سا کھٹکا دبا کر آپ جو روشنی بکھیر دیتے ہیں، اُس تک پہنچنے میں انسان کو کئی صدیاں لگیں۔ دنیا کے اندھیرے کا خوف پرانے زمانے کے انسان میں اس طرح بیٹھ گیا ہوگا کہ ہم آج بھی خوشی کا اظہار روشنیاں جلا کر کرتے ہیں۔

چولھا

بعض لوگ بہت جلتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ جلنا ان کی فطرت ہے۔ ایسے "جل ککڑوں" کو کوئی پسند نہیں کرتا اور نہ ایسے لوگوں کو پسند کیا جاتا ہے جو ذرا ذرا سی بات پر بھڑک اُٹھتے ہیں۔ کسی نے کچھ کہہ دیا اور ان کے آگ لگ گئی۔ بھڑک کر شعلہ بن جانے والوں اور جلتے رہنے والوں میں تو بس چولھے کی بات نرالی ہے۔ اس کی آگ سب کو اچھی لگتی ہے۔ کوئی اس پر پکنے والے کھانوں کی خوشبو سونگھتا ہے۔ چولھا بھی عجیب چیز ہے۔ خود آگ میں جلتا رہتا ہے کہ ہماری بھوک کی آگ بجھا سکے۔

چولھے کا جلنا گھر بار میں برکت کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ پہلے زمانے میں، جس گھر میں چولھا نہیں جلتا تھا تو محلّے والے سمجھ جاتے تھے کہ اس گھر کے رہنے والوں پر کوئی مصیبت پڑی ہے جو ان کا چولھا ٹھنڈا ہے۔

چولھے بنانا اور پھر آگ جلانا انسان نے فوراً نہیں سیکھ لیا۔ چولھا جلانے میں کافی وقت لگا۔

انسان کی ابتدائی دریافت اور ایجادوں میں آگ بہت اہم ہے۔ آگ نہ جلتی تو نہ روشنی ہوتی نہ گرمی۔ آگ نے نامعلوم اندھیروں کو دور بھگا کر انسان کا خوف دور کیا اور دنیا کو اس پر مزید واضح کیا۔ آگ کی مدد سے کھانا پکانا شروع کیا، ورنہ اس سے پہلے انسان صرف وہ کھاتا تھا جو پکائے بغیر کھایا جا سکتا تھا۔

آگ کی دریافت انسان کی ابتدائی فتوحات میں بہت اہم تھی۔ آگ کی طاقت نے انسان کے لیے بہت سی چیزوں کو ممکن بنا دیا۔ یونان کے پرانے باشندے کہتے تھے کہ اصل میں آگ دیوتاؤں کے پاس رہتی تھی، اور پرومیتھیس انسانوں کے لیے آگ چُرا کر لایا تھا۔ دیوتاؤں نے اس کو یہ سزا دی کہ ایک عقاب ہر وقت اس کا جگر نوچتا تھا۔ اس روایت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آگ کی دریافت کرنے والا شخص انسانیت کے لیے ہیرو کا سا درجہ رکھتا ہے۔

آگ جلا کر انسان نے ان غاروں کی سردی کو دور کیا جو اس کا پہلا گھر تھا۔ آگ سے جنگلی جانوروں کو دور رکھنے میں بھی مدد ملتی تھی۔ آگ کے گرد بیٹھ کر کھانا کھاتے ہوئے کسی آدمی کے حصّے کا گوشت آگ میں گر گیا ہو گا۔ اس نے اُٹھا کر کھایا ہو گا تو پتہ چلا ہو گا کہ آگ میں بھُن کر اس کا مزہ بہتر ہو گیا ہے۔ یوں پکانے کی ابتداء ہوئی ہو گی۔

کھلی آگ کو تیز ہوا سے بچانے کے لیے آگ ایک خاص جگہ رکھا جاتا اور اس کے چاروں طرف پتھر لگا دیے جاتے۔ یہ آتش دان بن گیا۔ ہزاروں برس تک یہ آتش دان، جس سے چولھے کا کام بھی لیا جاتا، گھر کا مرکز بنا رہا۔ گھر والے اس کے گرد جمع ہو کر بیٹھتے، اور کوئی دشمن بھی

یہاں پہنچ جاتا تو اس کو مہمان سمجھ کر اس کو کھانے میں شریک کر لیا جاتا۔
گرم ملکوں میں آتش دان کی اتنی ضرورت نہیں تھی۔ قدیم مصر اور یونان میں دھات یا پتھر کے برتنوں میں جلتے ہوئے کوئلے رکھ لیے جاتے، اور انھیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا آسان ہو جاتا۔ یہ انگیٹھی کی پہلی شکل تھی۔ گھروں کو گرم رکھنے کی ضرورت کو روم کے لوگوں نے بڑا اعلا اور عمدہ انتظام کرنے پر اُکسایا۔ یہ طریقہ حمّام کو گرم رکھنے کے لیے رائج تھا اور امراء کے گھروں میں بھی استعمال ہونے لگا۔ کھوکھلی دیواروں اور فرش کے ذریعے باہر کی آگ کی گرمی کو گھر کے کونے کونے میں پہنچایا جاتا۔ یہ انتظام خاصا جدید ہے۔
پاکستان کے شمالی علاقوں اور گلگت میں، جہاں شدید سردی پڑتی ہے۔ اب بھی ایسے گھر بنائے جاتے ہیں جن کے بیچ میں آگ جلائی جاتی ہے اور دھوئیں کے ذریعے گرمی حاصل کی جاتی ہے۔
دھوئیں سے بچاؤ کے لیے آتش دان کو گھر کے ایک کونے میں تعمیر کیا جانے لگا۔ یورپ کے محلوں اور قلعوں کے طویل کمروں اور ایوانوں میں بڑے بڑے آتش دان بنائے جاتے۔ تیرھویں صدی کے انگلستان میں پہلا دو دہان چمنی کی شکل میں سامنے آیا جو سارا دھواں کمرے کے باہر لے جاتا۔
لکڑی اور کوئلے جلا کر آگ اور گرمی حاصل کرنے کے مختلف طریقے آزمائے گئے۔ روس میں ایسے بڑے بڑے چولھے یا اسٹو رائج تھے، جن پر بعد میں سویا جاتا تھا تاکہ ان کی گرمی سے فائدہ اٹھایا جائے۔
جن آتش دانوں کے گرد بیٹھ کر جاڑے کی لمبی لمبی راتوں میں سارے گھر والے اکٹھے ہوتے اور قصے کہانیاں سناتے، وہ اب قصہ پارینہ بن گئے۔ آج کل کے گھروں میں سنٹرل ہیٹنگ سے گرمی پہنچتی ہے۔ پہلے لکڑی اور کوئلہ ایندھن کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ اب ان کی جگہ تیل، سوئی گیس

اور بجلی نے لے لی ہے اور وہ دن بھی دور نہیں جب یہ سارے کام شمسی توانائی سے لیے جائیں گے۔

آتش دان کے ساتھ ساتھ چولھا بھی ترقی کرتا گیا۔

سب سے پہلا چولھا یوں بنا ہوگا کہ زمین پر ذرا سی جگہ صاف کر کے آگ پر کچھ پکنے کو رکھ دیا گیا ہوگا۔ جب برتن استعمال ہونے لگے تو انھیں جلتی آگ پر رکھ کر یا آتش دان پر لٹکا کر ان میں پکایا جانے لگا۔

ایندھن کے مختلف ذرائع کے ساتھ ساتھ چولھوں کی شکلیں بھی بدلتی رہی ہیں۔ ہمارے ہاں پہلے چولھے میں عام طور پر لکڑی جلائی جاتی تھی۔ اور آگ کو بھڑکانے کے لیے پھونکنی سے پھونکیں ماری جاتی تھیں۔ پھر مٹی کے تیل کے چولھے عام ہوگئے۔ یہ چولھے بعض مرتبہ پھٹ بھی جاتے ہیں اور لوگوں کو نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔

روٹی پکانے کے لیے بہت سے معاشروں میں ایک خاص وضع کا چولھا استعمال ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں روٹی تندور میں پکتی ہے۔ تندور سے روٹی خوب سنک کر اور سرخ ہو کر نکلتی ہے۔

گیس اور بجلی نے اب چولھے کی کایا پلٹ دی ہے۔ کھانا پکانا اتنا صبر آزما کام نہیں رہا۔ مائکروویو نے کھانے پکانے کو چند لمحوں کی بات بنادیا ہے۔ چولھا اب بھی جل رہا ہے۔

برتن

چائے کی پیالیاں، تشتریاں، رکابیاں، پتیلیاں، قابیں، پیالے

ڈونگے، بھگونے، دیگچے، کٹورے، مٹکے، صراحیاں، بوتلیں اور گلاس —
ہماری زندگی میں کتنے بہت سے برتن کھنک رہے ہیں۔ یہ خاموشی سے اور کبھی باآواز بلند ہمارے ہر کھانے میں شریک ہوتے ہیں۔ یہ نہ ہوں تو کھانے کس میں پکیں، کیسے کھایا جائے اور کہاں رکھا جائے۔ اپنا کام ختم کر کے برتن الماریوں اور دیواروں پر واپس چلے جاتے ہیں تو ان کے دم قدم سے گھر گرہستی آباد لگتی ہے۔

برتن بہت دور سے آئے ہیں۔ انھوں نے انسان کے ساتھ ساتھ بڑا سفر طے کیا ہے تب کہیں جا کر آج کی اس صورت کو پہنچے ہیں۔

پتھر کے دور کے لوگ جب شکار کرتے کرتے کھیتی باڑی کرنے لگے تو اس وقت ان کے پاس سامان رکھنے کے لیے اپنی بنائی ہوئی ایک چیز تھی اور وہ تھی ٹوکری۔ یہ ٹوکری گھاس یا تنکوں سے بنی ہوتی۔ ٹوکریوں کو مضبوط کرنے کے لیے بعض لوگ ان کے اندرونی حصّے میں چکنی مٹّی کی تہہ جما دیتے۔

ٹوکری بہت دنوں تک سارا بوجھ اُٹھاتی رہی۔ مگر ان لوگوں پر ایک دن اچانک ایک حیرت انگیز بات کا انکشاف ہوا۔ اگر ٹوکری کو آگ کے پاس رکھ دیا جاتا تو اس کا جو حصّہ مٹّی کا بنا ہوا تھا وہ سخت ہو جاتا۔ اور اگر ٹوکری کا گھاس پھونس اور تنکوں والا حصّہ الگ کر لیا جاتا تب بھی یہ سختائی ہوئی مٹّی اپنی شکل برقرار رکھتی۔ مٹّی کے اس خول میں یہ خاصیت تھی کہ اگر اسے دوبارہ آگ پر رکھ دیا جاتا تب بھی یہ نہیں ٹوٹتا، اور اس میں پانی بھر دیا جاتا تو پانی نہ رِستا نہ ٹپکتا۔ پانی کو ذخیرہ کرنے اور آگ سے نہ جلنے والی یہ چیز پہلا برتن تھی۔

مٹّی کے اس برتن نے جلد ہی انسان کی زندگی میں اپنی جگہ بنالی اور اپنی افادیت کا احساس دلا دیا۔ آخر وہ وقت بھی آگیا کہ برتن ضروریاتِ

زندگی بن گئے۔

مٹّی کی فراہمی بھی آسان تھی اور اسے مختلف شکلوں میں ڈھالنا بھی۔ مٹّی کے برتن ایک اہم سہولت بن گئے اور مٹّی کے برتن بنانے کا ہُنر بڑے کام کا ثابت ہوا۔

برتن بنانے کا ہُنر ایک باقاعدہ فن بن گیا۔ صدیوں کے سفر میں طرح طرح کے برتن استعمال ہونے لگے۔ ان کی شکلیں بھی مختلف تھیں اور کام بھی الگ۔

برتنوں نے اپنی زندگی کا آغاز باورچی خانے سے کیا تھا، مگر وہاں سے باہر نکل کر نازک اور دلکش پیالے اور گل دان بن گئے۔ نقّاشی اور پچّی کاری والے مظروف، قدیم بابل مصر اور یونان کے امراء اور رؤسا کے گھروں کی زینت تھے۔ میکسیکو کے قدیم باشندے جو آزٹیک کہلاتے تھے عجیب وغریب شکلوں کے برتن بناتے تھے۔ ان کے برتن جانوروں یا لوگوں کی شکل پر بنائے جاتے تھے۔ انھوں نے ایسے برتن بھی بنائے جو کھانا پکنے کے دوران سیٹی یا جھنجھناہٹ کے ذریعے موسیقی کا سماں پیدا کر دیتے تھے۔

اس تمام عرصے میں، لوگ کھانے کے ذائقے اور غذائیت کو بہتر بنانے کی کوششیں بھی کر رہے تھے۔ جلد ہی انھیں پتا چل گیا کہ کھانے کو ڈھانپ دیا جائے تو زیادہ دیر تک گرم رہتا ہے اور اس کا ذائقہ بھی دیر تک برقرار رہتا ہے۔ اس مقصد کے لیے ڈھکنے والے برتن بننے لگے اب برتنوں کے لیے مختلف دھاتیں استعمال ہونے لگیں، تانبا، پیتل اور بعض مرتبہ لوہا، دھات کے بنے ہوئے برتنوں کا فائدہ یہ تھا کہ یہ مضبوط اور دیرپا ہوتے تھے۔ یہ برتن محض سہولت ہی نہیں بلکہ گھر کا اثاثہ اور دولت بھی سمجھے جاتے تھے۔

کھانا پکانے کو ہزاروں برس پہلے ہی اعلا درجے کا فن سمجھا جانے

لگا تھا۔ قدیم یونان کے دولت مند لوگ، بڑی بڑی دعوتوں کا اہتمام کرتے۔ جن میں ماہر فن باورچیوں کی بھاری اخراجات کے بعد حاصل کی جاتیں اور اعلا درجے کے برتنوں میں کھانا چنا جاتا۔ قدیم روم کے باشندے عمدہ کھانوں کے بہت دلدادہ تھے، اور باورچی خانے میں کام کرنے والے ہنرمند اور ماہر غلاموں کو بھاری رقم خرچ کر کے حاصل کرتے۔ قلتی قوم کی ایک ملکہ کو کھانے کا ایسا شوق تھا کہ اس نے وصیت کی کہ اسے اس کے پسندیدہ برتن کے ساتھ دفن کیا جائے۔ خدا معلوم اسے قبر میں کس ضیافت کی توقع تھی؟

پکانے ریندھنے کے معاملے میں فرانسیسی لوگ بڑے ماہر ہیں۔ کھانے اور پکانے کے معاملے میں ان کی مہارت اور نفاست کچھ آج کی بات نہیں بلکہ اس کا ذکر تاریخ میں ملتا ہے۔ سات سالہ جنگ میں ایک مشہور فرانسیسی جرنیل کو اپنی فوج کی شکست کی خبر نے آزردہ کر دیا۔ لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ دشمن اس کے باورچی کو گرفتار نہیں کر پایا تو جرنیل کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا۔ ایک فرانسیسی بادشاہ نے تئیس باورچی ملازم رکھے ہوئے تھے جو اسّی مختلف برتنوں میں شاہی دسترخوان کے لیے مسالے اور چٹنیاں، مربّے تیّار کرنے پر مامور تھے۔

بادشاہوں کے اس بے جا اصراف کے مقابلے میں، عام آدمی بہت سادگی سے رہتے، امریکا کے ابتدائی آبادکار، معمولی چیزوں پر گزارہ کرنے کے عادی تھے۔ لکڑی کے پیالے، تشتریاں عام تھیں اور اکثر لوگ اپنے استعمال کی چیزیں خود ہی بنا لیتے۔ جرمنی اور انگلستان میں چینی کے برتن ایک صنعت بن گئے اور دور دور تک ان کی تجارت ہونے لگی۔

ہندستان اور پاکستان کے کھانوں کی طرح، برتن بھی اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں۔ اچھے اچھے کھانے پکانا اور کھانا۔ برصغیر کے مسلمان حکمرانوں کے

دور میں ترقی کر کے ایک فن کا درجہ اختیار کر گیا' اور ان کے دستر خوان، خوان نعمت، معلوم ہونے لگے۔ کیا بادشاہ اور کیا عوام سبھی چٹخارے کے قائل تھے۔ پُرانی کتابوں میں اس وقت کے دستر خوان کا احوال آج پڑھیں تو افسانوی معلوم ہوتا ہے۔ ان میں سے بہت سے کھانے اور جن برتنوں میں وہ کھائے جاتے تھے، آج ہمارے لیے اجنبی ہیں۔

میر امّن کی مشہور کتاب" باغ وبہار" جسے قصّہ چہار درویش بھی کہا جاتا ہے۔ ۱۸۴۹ء میں پہلی بار چھپی تھی۔ دوسرے درویش کی سیر میں ایک جگہ گھر کے اسباب کی فہرست گنوائی گئی ہے جس سے اس زمانے کے برتنوں کے نام معلوم ہوتے ہیں۔ اس فہرست میں جو برتن شامل ہیں وہ یہ ہیں:

دیگ۔ دیگچے۔ پتیلے۔ طباق۔ رکابی۔ بادیے۔ تشتری۔ چمچے۔ بکادلی کفگیر۔ طعام بخش۔ سر پوش۔ سینی۔ خوان پوش۔ تورہ پوش۔ آب خورے۔ بجھرے۔ صراحی۔ لگن۔ پاندان۔ چوگھرے۔ چنگیر۔ گلاب پاش۔ عود سوز آفتابہ۔ چلمچی۔

زمانہ کے ساتھ ساتھ دستر خوان اُٹھ جاتا ہے اور برتن بدل جاتے ہیں۔ مٹّی کے برتن پہلے عام تھے۔ صراحی اور مٹکے کی جگہ اب کولر میں پانی رکھا جاتا ہے۔ تانبے اور پیتل کے برتن، قیمتی سمجھے جاتے تھے اور جہیز میں دیے جاتے تھے۔ بُرا وقت پڑنے پر یہ برتن بیچ کر گھر چلایا جاتا تھا۔ اب ان کی جگہ اسٹین لیس اسٹیل کے برتن آ گئے ہیں۔ باورچی خانے میں بھی زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح مشینوں کا استعمال بڑھتا جا رہا ہے۔ اس کے باوجود پرانے انداز کے برتنوں کی قدر و قیمت میں کمی نہیں آئی۔ سندھ کے تاریخی شہر ہالہ میں روایتی مظروف سازی کا مرکز ہے۔ ان کے نیلے اور سفید نقش و نگار مخصوص ہیں اور دور سے پہچانے جاتے ہیں۔ یہ رنگ اور یہ نقش

آنکھوں کو ایسی ٹھنڈک اور سکون کا احساس دیتے ہیں جو کسی اور طرح سے ممکن نہیں۔

پُرانا دسترخوان

کسی کے دسترخوان پر بن بلائے بیٹھ جانا اور پوچھے بغیر کھانے میں شریک ہو جانا خلافِ تہذیب بات ہے۔ ہم آپ بھلا ایسی حرکت کیوں کرنے لگے؟ لیکن وہ دسترخوان کئی سو برس پُرانا ہے، اور اس پر انواع واقسام کے کھانے بہت قرینے سے چنے ہوتے ہیں۔ ان میں سے چند ایک کھانوں کو تو ہم پہچانتے ہیں، باقی ہمیں بے حد انوکھے معلوم ہو رہے ہیں۔ ان کی خوشبو ایسی ہے کہ ہم ان کی ایک جھلک دیکھنے اور ایک نوالہ چکھنے کے لیے بیتاب ہو جاتے ہیں۔ بے اختیار ہاتھ اُٹھ جاتا ہے اور مُنہ میں پانی بھر آتا ہے۔ یہ پُرانے زمانے کا دسترخوان ہے۔ یہ کتنے ہی سوالوں کو جنم دیتا ہے۔ ہم سے پہلے کے لوگ کون سے کھانے کھاتے تھے؟ اور مٹھاس کیسی پسند کرتے تھے؟ ان کی روٹی کس وضع کی ہوتی تھی؟ وہ کیسے برتنوں میں کھاتے پیتے تھے؟ کھانے کے آداب کیا برتتے تھے اور اس زمانے میں کھانے کا کیا سلیقہ مروّج تھا؟ کیا ہم ان کے دسترخوان پر اپنے آپ کو اجنبی محسوس کریں گے؟

پرانا دسترخوان کا لطف اُٹھانے کے لیے ہمیں بن بلائے کسی کے شریک ہونے کی ضرورت نہیں۔ اردو کے کلاسیکی ادب میں اس زمانے کے

کھانوں اور کھانے سے متعلق طور طریقوں کا ذکر اس انداز میں ملتا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ضیافتِ دوام ہے اور ہم وہاں موجود ہیں۔

ذرا پچھلی صدی کے دسترخوان کا اہتمام دیکھیے۔ میر امن دہلوی کی مشہور کتاب "باغ و بہار" میں دوسرے درویش نے دسترخوان کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس دسترخوان پر قسم قسم کے کھانے چُنے ہوئے ہیں، لیکن کھانے کا سلیقہ اور ادب آداب بھی دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

ایک دالان میں لے جا کر بٹھایا اور گرم پانی منگوا کر ہاتھ پاؤں دھلوائے۔ اور دسترخوان بچھوا کر مجھ تن تنہا کے روبرو بکاولی نے ایک تورے کا تورا چن دیا۔ چار مشقاب۔ ایک میں یخنی پلاؤ۔ دوسری میں قورما پلاؤ۔ تیسری میں متنجن پلاؤ اور چوتھی میں کوکو پلاؤ۔ اور ایک قاب زردے کی اور کئی طرح کے قلیے۔ دوپیازہ۔ نرگسی۔ بادامی۔ روغن جوش اور روٹیاں کئی قسم کی۔ باقرخانی، تنکی، شیرمال، گاؤدیدہ، گاؤزبان، نان نعمت، پراٹھے، اور کباب کوفتے کے، تکے کے، مرغ کے، خاگینہ، ملغوبہ، شب دیگ، دم پخت، حلیم، ہریسا، سموسے ورقی، قبولی، فیرنی، شیر برنج، ملائی، حلوہ، فالودہ، پن بھتا، نمش، آبشورہ، ساق عروس، لوزیات، مربا، اچار دان، دہی کی قلفیاں، یہ نعمتیں دیکھ کر روح بھر گئی۔ جب ایک ایک نوالا ہر ایک سے لیا پیٹ بھی بھر گیا۔ تب ہاتھ کھانے سے کھینچا۔

وہ شخص مجوز ہوا کہ "صاحب نے کیا کھایا؟ کھانا تو سب امانت دھرا ہے۔ بے تکلف اور نوش جان فرمائیے"۔ میں نے کہا "کھانے میں شرم کیا ہے؟ خدا تمہارا خانہ آباد رکھے۔ جو کچھ میرے پیٹ میں سمایا سو

میں نے کھایا۔ اور ذائقے کی اس کے کیا تعریف کروں! کہ اب تک زبان چاٹتا ہوں۔ اور جوڑ کار آتی ہے سو معطر۔ لواب مزید کرو۔" جب دسترخوان اٹھا زیرانداز، کاشانی مخمل کا مقیشی بچھا کر چلمچی، آفتابہ طلائی لاکر بیسن دان میں سے خوشبو بیسن دے کر گرم پانی سے میرے ہاتھ دھلائے۔ پھر پاندان جڑاؤ میں گلوریاں سونے کی پکھروٹوں میں بندھی ہوئیں، اور چوگھروں میں کھلوریاں اور چکنی سپاریاں اور لونگ الائچیاں روپے کے ورقوں میں مڑھی ہوئیں لاکر رکھ دیں۔ جب میں پانی پینے کو مانگتا تب صراحی برف میں لگی ہوئی آبدار لے آتا۔

یہ تو خیر قصے کہانی کی بات ہے۔ لیکن تاریخ بھی کسی افسانے سے کم دلچسپ نہیں۔ آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کا دسترخوان کیسے کھانوں سے سجتا تھا اور شاہی دسترخوان کے کیا ٹھاٹ باٹ تھے، اس کا بیان منشی فیض الدین دہلوی نے اپنی کتاب "بزم آخر" میں کیا ہے، اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

لو! ڈیڑھ پہر دن چڑھا، خاصے کی داروغہ نے عرض کیا "کرامات خاصے کو کیا حکم ہے؟" حکم ہوا "اچھا"۔ جسولنی نے خاصے والیوں کو آواز دی "بیویو! خاصہ لاؤ، نعمت خانہ تیار کرو!"

خاصہ

کہاریاں، کشمیرنیں دوڑیں؛ دیکھو! ہنڈکلیا، چھوٹے خاصے، بڑے خاصے کے خوان سر پر لیے چلی آتی ہیں، خوانوں کا تار لگ رہا ہے۔ ایلو! خاصے والیوں نے پہلے ایک سات گز لمبا تین گز چکلا چمڑا بچھایا، اوپر سفید دسترخوان بچھایا، بیچوں بیچ میں دو گز لمبی، ڈیڑھ گز چکلی، چھ گز اونچی، چوکی لگا، اس پر بھی پہلے چمڑا پھر دسترخوان بچھا، خاص خوراک کے خوان مہر لگے ہوئے چوکی پر لگا، خاصے کی داروغہ سامنے ہو بیٹھی۔ اس پر بادشاہ

خاصہ کھائیں گے ؛ باقی دسترخوان پر بیگماتیں، شاہزادے، شاہزادیاں کھانا کھائیں گی۔ لو اب کھانا چُنا جاتا ہے۔

کھانوں کے نام

چپاتیاں، پُھلکے، پراٹھے، روغنی روٹی، بری روٹی، بیسنی روٹی، خمیری روٹی، نان، شیرمال، گاؤ دیدہ، گاؤزبان، کلچہ، باقر خانی، غوصی روٹی، بادام کی روٹی، پستے کی روٹی، چاول کی روٹی، گاجر کی روٹی، مصری کی روٹی، نان پنبہ، نان گلزار، نان قماش، نان تنکی، بادام کی نان خطائی، پستے کی نان خطائی، چھوارے کی نان خطائی، یخنی پلاؤ، موتی پلاؤ، نور محلی پلاؤ، نکتی پلاؤ، فالسائی پلاؤ، ابی پلاؤ، سنہری پلاؤ، رو پہلی پلاؤ، بیضہ پلاؤ، اناس پلاؤ، کوفتہ پلاؤ، بریانی پلاؤ، چلاؤ، سارے بکرے کا پلاؤ، بونٹ پلاؤ، شولہ، کھچڑی، کشمش پلاؤ، نرگسی پلاؤ، زمردی پلاؤ، لال پلاؤ، مزعفر پلاؤ، قبولی، طاہری، متنجن، زردہ، مزعفر، سویاں، من وسلوی، فرنی، کھیر، بادام کی کھیر، کدو کی کھیر، گاجر کی کھیر، کنگنی کی کھیر، یاقوتی، نمش، دودھ کا ڈلمہ، بادام کا ڈلمہ، سموسے سلونے میٹھے، شاخیں، کھجلے، قتلمے، قورمہ، قلیہ، دوپیازہ، ہرن کا قورمہ، مرغ کا قورمہ، مچھلی، بورانی رائتا، کھیرے کی دوغ، ککڑی کی دوغ، پنیر کی چٹنی، سمنی، آش، دہی بڑے، بینگن کا بھرتا، آلو کا بھرتا، چنے کی دال کا بھرتا، آلو کا ڈلمہ، بینگن کا ڈلمہ، کریلوں کا ڈلمہ، بادشاہ پسند کریلے، بادشاہ پسند دال، سیخ کے کباب، شامی کباب، گولیوں کے کباب، تیتر کے کباب، بٹیر کے کباب، نکتی کباب، لوزات کے کباب، خطائی کباب، حسینی کباب، روٹی کا حلوا، گاجر کا حلوا، کدو کا حلوا، پستے کا حلوا، رنگترے کا حلوا، آم کا مربا، سیب کا مربا، بہی کا مربا، ترنج کا مربا، کریلے کا مربا، رنگترے کا مربا، لیموں کا مربا، اناس کا مربا، گڑھل کا مربا، بادام کا مربا، کگروندے کا مربا، بانس کا مربا، ان سب قسموں کے اچار، اور کپڑے کا اچار بھی، بادام

کے نقل، پستے کی نقل، خشخاش کی نقل، سونف کے نقل، مٹھائی کے رنگترے، شریفے، امرود، جامنیں، انار وغیرہ اپنے اپنے موسم میں، اور گیہوں کی بالیں مٹھائی کی بنی ہوئی، حلوا سوہن گری کا، پپڑی کا، گوندے کا، حبشی، لڈو موتی چور کے، مونگ کے، بادام کے، پستے کے، ملائی کے، لوزات مونگ کی، دودھ کی، پستے کی، بادام کی، جامن کی، رنگترے کی، فالسے کی، میٹھے کی مٹھائی، پستہ مغزی، امرتی، جلیبی، برفی، پھینی، قلا قند، موتی پاک، دربہشت، بالوشاہی، اندرسے کی گولیاں، اندرسے وغیرہ۔ یہ سب چیزیں قابوں، طشتریوں، رکابیوں، پیالوں، پیالیوں میں قرینے سے چُنی گئیں، بیچ میں سفل دان رکھ دیے، اور پرنعمت خانہ کھڑا کر دیا کہ مکھیاں دسترخوان پہ نہ آویں۔ مشک، زعفران، کیوڑے کی بو سے تمام مکان مہک رہا ہے۔ چاندی کے ورقوں سے دسترخوان جگمگا رہا ہے۔ چلمچی، آفتابہ، بیسن دانی، چنبیلی کی کھلی، صندل کی ٹکیوں کی ڈلیاں، ایک طرف زیر انداز پر لگی؛ رومال، زانو پوش، دست پاک، بینی پاک، ایک طرف رومال خانے والیاں ہاتھوں میں رومال لیے کھڑی ہیں۔ جسولنی نے عرض کیا "حضور خاصہ تیار ہے"۔ بادشاہ اپنی تنیک کرچوکی کے سامنے آن کر بیٹھے؛ داہنی طرف ملکۂ دوراں اور بیگماتیں، بائیں طرف شاہزادے، شاہزادیاں بیٹھیں؛ رومال خانے والیوں نے زانو پوش گھٹنوں پر ڈال دیے، دست پاک آگے رکھ دیے۔ خاصے کی داروغہ نے خاص خوراک کی مہر توڑ خاصہ کھلانا شروع کیا۔ دیکھو! بادشاہ آلتی پالتی مارے بیٹھے خاصہ کھا رہے ہیں؛ بیگماتیں، شاہزادے، شاہزادیاں، کیسے ادب سے بیٹھی، نیچی نگاہ کیے کھانا کھا رہی ہیں۔ جس کو بادشاہ اپنے ہاتھ سے آلش مرحمت فرماتے ہیں؛ کیسا سرو قد کھڑے ہو کر آداب بجا کر لیتا ہے۔

اہلو! اب بادشاہ خاصہ کھا چکے، دعا مانگی، پہلے بیسن، پھر کھلی اور

صندل کی ٹکیوں سے ہاتھ دھوئے، دسترخوان بڑھا یا۔ پلنگ خانے والیوں نے جھٹ پٹ پلنگ جھاڑ جھوڑ، او قچہ، گبھا، چادر کس کسا تکیے، گل تکیے لگا، تکیہ پوش ڈال، دلائی، چادر، رضائی، پائنتی لگا، پلنگ آراستہ کیا، بادشاہ خوابگاہ میں آئے، پلنگ پر بیٹھے، ٹھنڈا نوش کیا، گھنٹہ بھر بعد آب حیات مانگا۔ آبدار خانے کی داروغہ نے گنگا کا پانی جو صراحیوں میں بھرا برف میں لگا ہوا ہے، جھٹ ایک توڑ کی صراحی نکال، مہر لگا، گیلی صافی لپیٹ، خوجے کے حوالہ کیا۔ اس نے بادشاہ کے سامنے مہر توڑ، چاندی کے ظرف میں نکال بادشاہ کو پلایا۔ دیکھو پیتے وقت سب کھڑے ہو گئے۔ جب پی چکے تو سب نے ''مزید حیات'' کہا۔ مجرا کیا۔ اے لو۔ دو پہر بجی، بادشاہ پلنگ پر دراز ہوئے۔ خواب گاہ کے پردے چھٹ گئے۔ چپی والیاں چپی پر بیٹھیں۔ دیکھو تو اب کیسی چپ چاپ ہوگئیں۔ کیا مجال کوئی ہوں تو کر سکے۔

بادشاہ سلامت تو خاصہ تناول فرما کر قیلولہ کرنے گئے۔ ان کی آنکھ کیا جھپکی شاہی دسترخوان سمٹ گیا۔ خاصے کی جگہ خاک اڑنے لگی۔

شاہی دسترخوان کی گہما گہمی کا تو کہنا ہی کیا۔ لیکن کھانوں کی یہ ریل پیل، زبان کے چٹخارے سبھی کے لیے تھے۔ کیا امیر اور کیا غریب، دلی کے چٹخارے اب بھی مشہور ہیں۔ بہادر شاہ ظفر کی جلاوطنی اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد بھی دہلی کی معاشرت اور تہذیب میں کھانے کا یہ اہتمام شامل رہا۔ شاہد احمد دہلوی نے دہلی کے اس عہد کی بڑی خوبصورت تصویر کھینچی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''شاہی ۱۸۵۷ء کے ساتھ ختم ہوئی، مگر دلی والوں کی زبان کا چٹخارہ اور شاہ خرچیاں ختم نہ ہوئیں۔ دلی کے چٹخارے کا حال شاہد احمد دہلوی کی زبانی سنیے:

''زبان کے چٹخارے کا حال آیا ہے تو اس شہر والوں کے ایک اسی پہلو کو لے لیجیے۔ دلی والوں کو اچھا کھانا اور طرح طرح کے کھانوں کا شوق تھا۔ یہ شوق انھیں ورثے میں ملا تھا۔ اگلے دلی والوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو بادشاہ

سے بالواسطہ یا بلا واسطہ وابستہ نہ ہو۔ بادشاہ کی دولت میں سے حصّہ رسد سب کو پہنچتا تھا۔ مہنگائی نام کو نہ تھی۔ روپے پیسے کی طرف سے فراغت، بے فکری سے کماتے تھے اور بے فکری سے اُڑاتے تھے۔ اور باتوں کی طرح کھانے پینے میں بھی قلعہ والوں کی تقلید کی جاتی تھی۔ ہر قسم کے کھانے رکابدار اور باورچیوں سے تیار کرائے جاتے تھے۔ ہفت ہزاری سے لے کر ٹکے کی اوقات والے تک ہر ایک کو خود بھی اپنے ہاتھ کا کمال دکھانے کا شوق تھا۔ آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے کئی کھانے ایجاد کیے جن میں سے مرچوں کا دُلمہ آج بھی دلّی والوں کے گھروں میں پکایا جاتا ہے۔ غریبوں میں اب بھی کسی کسی کے ہاں طاہری ایسی پکتی ہے کہ بریانی اس کے آگے ہیچ ہے۔ کبھی ان کے ہاں مونگ پلاؤ یا یخنی پلاؤ کھانے کا اتفاق ہو تو انگلیاں ہی چاٹتے رہ جائیے۔ ماش کی دال ایسی مزیدار کہ کوئی اور لگاون اس سے لگا نہیں کھاتا۔

گھروں کے علاوہ بعض بازار کے دکانداروں نے کسی ایک چیز میں ایسا نام پایا کہ آج تک ان کی مثال دی جاتی ہے۔ مثلاً گھنٹے والا حلوائی، چڑیا والا کبابی، سرکی والوں کا کھیر والا، پائیوالوں کے چچا کبابی، قابل عطّار کے کوچے کا حلوہ سوہن والا، شاہ گنج کا نواب قلفی والا، فراش خانے کا شبابو بھٹیارا، لال کنویں کا حاجی نانبائی اور چاندنی چوک کا گنجا نہاری والا۔ یہ وہ نام ہیں جو دلّی میں زبان زد عام تھے۔ ورنہ شاید ہی کوئی محلّہ ایسا ہو جس میں ان سب سودے بیچنے والوں کی دکانیں نہ ہوں۔ مشہور دکانداروں کے ہاں سودا سلف صاف ستھرا، نفیس اور ذائقہ دار ہوتا ہے۔ پشتہا پشت سے ان کے ہاں یہی کام ہوتا چلا آتا ہے۔ ان کے خاندانی نسخے ان کے سینوں میں محفوظ رہتے ہیں، اور کہا جاتا ہے کہ ہر کاروبار کی طرح ان کے بھی چند بھید ہوتے ہیں۔ عوام کے اس نظریے نے اتنی شدّت اختیار

کی کہ طرح طرح کی روایتیں اور افواہیں شہر میں پھیل گئی تھیں۔

چچا کبابی گولے کے کباب ایسے بناتے تھے کہ سارا شہر ان پر ٹوٹا پڑتا تھا۔ پائے والوں کے رُخ جامع مسجد کی سیڑھیوں کے پہلو میں ان کا ٹھیا تھا۔ چچا کے دادا کے کباب بادشاہ کے دسترخوان پر جایا کرتے تھے۔ شہر میں مشہور تھا کہ چچا کے دادا جیسے کباب نہ تو کسی نے بنائے اور نہ آیندہ بنائے گا۔ ان میں کچھ ایسا سلونا پن پایا جاتا تھا کہ کھانے والا ہونٹ چاٹتا رہ جاتا تھا۔ ہم نے اکثر بڑے بوڑھوں سے پوچھا کہ آخر اُن کبابوں میں اور اِن کبابوں میں فرق کیا ہے؟ وہ کہتے "میاں بس چپکے ہو جاؤ۔ کچھ کہنے کا مقام نہیں ہے۔"

"آخر کچھ تو بتائیے۔"

"میاں سمجھے بھی یہ سلونا پن کاہے کا ہوتا تھا؟"

"نمک کا ہوتا ہوگا۔"

"اونھ۔ اماں آدمی کا گوشت کھلاتا تھا، آدمی کا۔"

"آدمی کا گوشت؟"

"اور نہیں تو کیا۔ جب وہ پکڑا گیا ہے اور اس کے گھر کی تلاشی ہوئی ہے تو سینکڑوں کھوپریاں تہہ خانے میں سے نکلیں۔"

"آپ نے خود دیکھا تھا؟"

"خود تو نہیں دیکھا، البتہ کان گنہگار ہیں۔"

"روزانہ آدمی غائب ہوتے رہیں اور کوئی انھیں تلاش نہ کرے؟"

"کیا پتا چل سکتا ہے؟ آدمیوں سے دنیا بھری پڑی ہے۔"

"مگر کھوپریاں آخر تہہ خانے میں کیوں بھر رکھی تھیں؟"

"اوہو بھئی مجھے کیا معلوم۔"

"مگر۔"

"اگر مگر کچھ نہیں۔ تمھاری تو عادت ہی حجّت کرنے کی ہے۔"
ناراض ہو کر چلے گئے۔

لاحول ولا قوۃ۔ بھلا یہ بھی کوئی سمجھ میں آنے والی بات ہے؟ سچ ہے افواہوں کی دیوی بڑی بھیانک ہوتی ہے جو اپنی ہزاروں خاموشی ٹکی ہوئی زبانوں سے ہوا میں بس گھولتی رہتی ہے۔

اصل میں اجزائے ترکیبی کے صحیح اور خاص تناسب کی وجہ سے ایک مخصوص ذائقہ پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر ناؤ بھاؤ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ بھلا کھیر ایسی کون سی انوکھی چیز ہے۔ مگر سرکی والوں کی دُکان کے پیالوں میں کچھ اور ہی مزہ ہوتا تھا۔ وہی دودھ، چاول اور شکر کا آمیزہ ہے، مگر تناسب اور ناؤ ہی تو ہے، یہ معلوم ہوتا تھا کہ دولت کی چاٹ کھا رہے ہیں۔

شابو بھٹیارے کے ہاں کا شوربہ مشہور تھا۔ اُن کا کہنا یہ تھا کہ :۔

"ہمارے ہاں بادشاہی وقت کا شوربہ ہے۔"
"ارے بھئی بادشاہی وقت کا؟ یہ کیسے؟"

"اجی حضت یہ ایسے کہ ہم شوربے میں سے روزانہ ایک پیالہ بچا لیتے ہیں، اور اگلے دن کے شوربے میں مِلا دیتے ہیں۔ یہ دستور ہمارے ہاں سات پیڑھی سے چلا آ رہا ہے۔ یوں ہمارا شوربہ شاہی زمانے سے چلا آتا ہے۔"

حاجی نانبائی کے ہاں یوں تو شادی بیاہ کے لیے خمیری، کلچے اور شیرمال تیار کیے جاتے اور ایسے ملائم کہ ہونٹوں سے توڑ لو، مگر ان کا ہُنر دیکھنا ہو تو فرمایش کر کے پکوا لیجیے۔ روٹیوں کے نام بھی سُن لیجیے۔

روغنی روٹی، بری روٹی، قیمہ بھری روٹی، بیسنی روٹی، گاؤ دیدہ،

گاؤزبان، باقرخانی، شیرمال، بادام کی روٹی، پستے کی روٹی، چاول کی روٹی، گاجر کی روٹی، مصری کی روٹی، غوثی روٹی، نان منبہ، نانِ گلزار، نانِ قماش، تافتان، روے کے پراٹھے، میدے کے پراٹھے، گول، چوگور، تکونے غرض روٹی کی کوئی شکل اور ترکیب ایسی نہیں ہے جوان کے تندور میں تیار نہ ہوسکتی ہو۔

افسوس کہ وہ شاہی زمانے سے چلا آنے والا شوربہ بھی ختم ہوا۔ اور یہ ساری باتیں ایک چٹ پٹی داستان بن کر رہ گئیں۔

چھری، کانٹے اور چمچے

دستر خوان پر کھانے چُن دیے گئے، برتنوں کی بہتات ہوئی تو اس کے بعد چمچے آن پہنچے اور چھُریاں بھی چلنے لگیں۔

ابتدائی زمانے کے انسان کو کھاتے وقت یہ سہولتیں میسّر نہ تھیں۔ نہ وہ ان تکلّفات کا قائل تھا۔ جو بھی ملتا ناخنوں سے اور دانتوں سے نوچ نوچ کر کھا جاتا۔ اگر کسی چیز کو کاٹنے کی ضرورت پڑتی تو ہڈّی کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے یا سیپی کے کھردرے کنارے سے یہ کام لیتا۔ پھر اس نے پتّھر کے تیز دھار والے ٹکڑوں سے یہ کام لینا شروع کر دیا۔ یہ پتّھر پہلا چاقو ثابت ہوئے۔ اس وقت کا انسان سیپیوں اور درخت کی چھال سے چمچے کا کام لیتا۔ گوشت کے گرم پارچوں کو لکڑی سے اٹھاتا۔ اور پانی پینے کے لیے ہتھیلیوں سے اوک بنا لیتا۔

جب لوگوں نے بستیاں بسائیں اور برادری کی شکل میں رہنا شروع کیا تو ایک دوسرے سے میل جول بڑھا اور کھانے کے آداب کی ضرورت پڑی۔

کھانے کے آداب ایک زمانے سے دوسرے زمانے تک اور ایک ملک سے دوسرے ملک تک بدلتے رہے ہیں۔ ہمارے ہاں اب سے چند برس پہلے تک فرش پر دستر خوان بچھا کر کھانا کھانے کا رواج عام تھا اور یہ دستور بہت پرانے زمانے سے چلا آرہا تھا۔ قدیم یونان کے امراء آرام دہ گدّوں پر نیم دراز ہو کر کھانا کھاتے اور بچّوں کے لیے بیٹھ کر کھانا کھانے کی شرط تھی۔ روم کے اُمراء عام طور پر ہاتھ سے کھانا کھاتے تھے۔ مگر بہت تکلف کے مہمان کو چمچہ، کانٹا اور خلال ضرور دیا جاتا۔ روم کا معاشرہ چھری کانٹے کے لوازمات سے واقف تھا، مگر خاص طور پر چھری چاقو اتنے مہنگے تھے کہ انھیں خریدنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔

یوروپی معاشرے میں بھی چھُری کانٹے عام نہیں تھے۔ ازمنۂ وسطیٰ میں چاقو، چھُریاں باورچی خانے میں استعمال ہوتے تھے اور میز پر لے جائے جاتے تھے۔ کھانا عام طور سے ہاتھ سے ہی کھایا جاتا۔ جو ٹکڑے بچ جاتے وہ میز کے نیچے ہی پھینک دیے جاتے تھے، جہاں اِن کو کھانے کے لیے خاص طور سے کتّے پالے جاتے تھے۔ گوشت، روٹی کے بڑے بڑے ٹکڑوں پر رکھ کر کھایا جاتا اور گوشت کھانے کے بعد روٹی کے یہ ٹکڑے غریبوں میں تقسیم کر دیے جاتے۔ کھانے کے بعد مہمان، میز پوش سے ہاتھ اور مُنہ پونچھ لیتے۔

اطالیہ کے لوگ اپنے مزاج کی نفاست کے لیے مشہور تھے۔ فلورنس کے امراء نے نوالہ مُنہ تک لے جانے کے لیے کانٹے کا استعمال شروع کیا۔ ان کی دیکھا دیکھی، یہ فیشن سارے یورپ میں پھیل گیا۔ جو لوگ کانٹے

خرید نہیں سکتے تھے، وہ خاص خاص موقعوں پر دوسروں سے مانگ تانگ کر کام چلاتے۔

کانٹے کی طرح چھری بھی دیر میں عام ہوئی۔ گھروں میں ایک سے زیادہ چھری نہیں ہوتی تھی، اس لیے مہمان اپنی اپنی چھری ساتھ لاتے۔ یہ چھری چاقو نیفے میں اڑسے ہوئے یا بیلٹ میں لگے ہوتے، اور کھانے کے علاوہ لڑنے کے وقت بھی باہر نکل آتے۔

چین میں پرانے زمانے سے ہی چھری کانٹے اور چمچے کے بجائے دو لمبی لمبی ڈنڈیوں کا رواج ہے جن کے درمیان نوالہ رکھ کر کھایا جاتا ہے۔ دوسرے ملکوں کے لوگ تعجب سے دیکھتے ہیں کہ چینی لوگ، دو پتلی پتلی ڈنڈیوں سے کیسے کھانا کھاتے ہیں۔

ہمارے دستر خوان پر چھری اور چمچے کو آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ چمچہ اصل میں ترکی زبان کا لفظ ہے اور بادشاہوں کے زمانے میں شوربا شربت یا کسی رقیق چیز کے پینے کے ظرف کا نام تھا۔ انگریزوں کی عملداری کے ساتھ ساتھ اس کا رواج بڑھتا گیا اور اسے جدید تہذیب کی نشانی سمجھا جانے لگا۔ لیکن ہم آپ جانتے ہیں کہ تہذیب اور شائستگی صرف چمچوں کے استعمال تک محدود نہیں۔

سوئی دھاگا

"اتنی سی بِٹیا، گز بھر کی چٹیا"

دادی اماں ایک پہیلی بوجھا کرتی تھیں۔ اس پہیلی کا جواب ہے

سوئی دھاگا

چھوٹی سی سوئی میں لمبا سا دھاگا پرو دیا جاتا ہے۔ پھر سوئی لپا جھپ کپڑوں کی تہوں میں اترنے لگتی ہے، ٹکڑوں کو جوڑنے لگتی ہے۔ کپڑے کے مختلف ٹکڑے مل کر ایک لباس بن جاتے ہیں، پھر سوئی کی آنکھ سے دھاگا نکال کر الگ کر دیا جاتا ہے۔ خالی سوئی کی نوک چبھنے لگتی ہے۔

سوئی پہلے پہل صرف ایک نوکیلا پن تھی۔ پتھر یا ہڈی کا پن چیزوں میں چھید کرنے کے کام آتا تھا۔ ایسی چیزوں کو جوڑنے کے لیے درختوں کے کانٹے یا ہڈی کے ٹکڑے استعمال ہوتے تھے۔

پتھر کے دور میں، جب لوگ جانوروں کی کھال کو لباس کے طور پر استعمال کرتے تھے، اکثر ایسا ہوتا کہ کوئی کھال چھوٹی پڑ جاتی۔ ایسی کئی چھوٹی کھالوں میں پن کے ذریعے چھید کر کے اُن میں جانور کی نسیں پرو دی جاتیں تو ایک لباس سا تیار ہو جاتا۔

مگر ایک دن، آدمی کو بہت عمدہ سوجھی۔ اس نے پن کے چپٹے حصے کو دو میں بانٹ دیا، اور اس شگاف میں نس کو اٹکا دیا۔ پھر جن چیزوں کو جوڑنا تھا، ان میں سے پن اور نس کو دونوں کو گزار دیا۔ یہ سوئی اور دھاگے کی ابتدا تھی۔

جلد ہی چپٹے حصے کے شگاف کی جگہ ناکے نے لے لی، اور یوں سوئی مکمل ہو گئی۔ سوئی نے اپنا کام شروع کر دیا اور سلائی کڑھائی کی ابتدا بھی ہو گئی۔

سلائی کڑھائی کا یہ نو دریافت ہنر پہلے پہل پہننے کے کپڑوں اور کشتیوں کے بادبان، سینے اور رفو کرنے تک محدود تھا۔ پھر سوئی سے نازک اور نفیس کام لیے جانے لگے۔ سینا بھی ایک فن کا درجہ اختیار کر گیا ماہر فن ہاتھوں نے ہر قسم کے کپڑے کی حسن کاری کا ڈھنگ سیکھ لیا۔

قدیم بابل، ایران اور چین کے مال دار لوگ کڑھے ہوئے لباس پہنتے تھے۔ امریکہ کے پرانے انکا باشندوں نے پارچہ بافی کو بہت ترقی دے لی تھی۔ اور اپنے لباسوں پر حیرت انگیز نقش و نگار بنایا کرتے تھے۔

ازمنۂ وسطیٰ کے محلوں میں پوری پوری دیواروں کے برابر مناظر کاڑھے جاتے تھے۔ انھیں ٹیپسٹری کہا جاتا تھا اور ان میں جنگی یا تاریخی مناظر کڑھائی کے ذریعے اُجاگر کیے جاتے تھے۔ یہ ہنرمندی سوئی کی بدولت تھی۔

کڑھائی اور سلائی کے ہُنر عورتوں کا دل پسند مشغلہ بن گئے۔ سلیقہ شعار کہلانے کے لیے اس ہنر میں مہارت حاصل کرنا، عورتوں کے لیے بہت اہم سمجھا جاتا رہا ہے۔

سوئی کی ایک بدلی ہوئی شکل اون بُننے کی سلائی بھی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ سوئی کی جگہ سلائی آ گئی ہے اور دھاگے کی جگہ اون۔ اس سے وہ سوئٹر بُنے جاتے ہیں جو ہمیں سردی سے محفوظ رکھتے ہیں۔ اُون کی بُنائی پہلی بار اسکاٹ لینڈ میں دریافت ہوئی۔

سلائی کی پہلی مشین ۱۸۲۰ء میں پیرس کے ایک درزی نے استعمال کرنا شروع کی تو سارا یوروپ ہکّا بکّا رہ گیا۔ سلائی مشین کا استعمال بہت بڑھ گیا ہے لیکن چھوٹی سی سوئی کی اہمیت آج بھی باقی ہے۔ ہزاروں لاکھوں برس کے بعد بھی سلائی کی کاریگری میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اور آئے بھی کیسے؟ اس کے ذمّے دنیا بھر کی رفو کاری، بخیہ کاری، پیوند لگانا اور پھٹے کو سینا ہے۔

پُرانے زمانے کے کپڑے

زبان اور رسم و رواج کی طرح لباس بھی مختلف علاقے کے لوگوں کی شناخت کو واضح کرتا ہے۔ مختلف علاقوں کے لوگ اپنے اپنے پہناوے سے پہچانے جاتے ہیں۔ دنیا کی مختلف قوموں کے اپنے اپنے مخصوص لباس ہیں جو ان علاقوں کے گرم و سرد موسم، رہن سہن کے طریقے اور لباس کے لیے خام مواد کی فراہمی کے لحاظ سے رائج ہوئے ہیں۔ جن علاقوں میں زیادہ سردی پڑتی ہے وہاں کے لوگ گرم اور اونی کپڑے پہنتے ہیں، گریبان بند اور سر ڈھکا رکھتے ہیں۔ بلکہ قطب شمالی کے پاس کے علاقوں میں جہاں سال بھر برف جمی رہتی ہے، جانوروں کی پوشاکیں اور سمور عام طور پر پہنے جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف گرم علاقوں میں کھلے کھلے اور ڈھیلے ڈھالے لباس عام ہیں۔ ہلکے اور ٹھنڈے رنگ پسند کیے جاتے ہیں۔ یہ لباس سادہ ہوتے ہیں یا زرق برق بھی ہو سکتے ہیں۔ پہننے والے کی پسند کے علاوہ اس کی عمر اور سماجی مرتبے کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔

معاشرے کی دوسری چیزوں کی طرح، لوگوں کے پہننے کے کپڑے بھی زمانے کے ساتھ ساتھ بدلے ہیں۔ لباس کی تراش خراش اور فیشن کے انداز بدلتے رہتے ہیں۔ آج جو کپڑے ہم پہنتے ہیں وہ آج سے سو سال پہلے کے لوگوں کو عجیب و غریب اور نامانوس معلوم ہوں گے، بالکل جس طرح ان لوگوں میں جس انداز کے کپڑے رائج تھے، وہ آج ہم پہن کر سڑک پر نکلیں تو شاید تماشا بن جائیں۔ ہر عہد، دوسرے عہد کے لیے اسی طرح تماشا بن جاتا ہے۔

ہمارے آباو اجداد، درختوں کی چھال اور جانوروں کی کھال سے اپنا تن ڈھانپتے تھے۔ جوں جوں تہذیب ترقی کرتی گئی، لباس تبدیل ہوتے رہے۔ تہذیب اور لباس میں اس طرح چولی دامن کا ساتھ ہے۔

برصغیر کے علاقے کے اپنے مخصوص کپڑے ہیں۔ یہ کپڑے آج سے نہیں، بہت پرانے زمانے سے دُنیا بھر میں مشہور ہیں، اور ان کی تجارت ہورہی ہے۔ مورخین کا بیان ہے کہ قدیم مصر کے باشندے اپنے مُردوں کو جس طرح کپڑے میں لپیٹ کر اہرام میں رکھتے تھے، تو ایسی ممیاں ملی ہیں جن کی تدفین میں استعمال ہونے والا کپڑا، اور کپڑے کو رنگنے کے لیے کام آنے والا نیل، قدیم ہندستان سے آیا تھا۔ قدیم ہندستان میں تیار کیے ہوئے کپڑے آشور یہ اور بابل کے علاوہ یونان اور روم میں بھی پسند کیے جاتے تھے۔ یہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے بھی کئی سو سال پہلے کی بات ہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ پارچہ بافی کی صنعت اس علاقے میں ترقی کرتے کرتے درجۂ کمال تک پہنچ گئی۔ مورخ کہتے ہیں کہ برصغیر میں سوتی، ریشمی اور اونی کپڑوں کی صنعت شروع سے اعلا درجے کی رہی۔ بادشاہوں کے زمانے میں حریر، پرنیاں اور زربفت قیمتی کپڑے تھے۔ امیر خسروؒ نے اپنے عہد کے بعض کپڑوں کے بارے میں لکھا ہے کہ گلاب اور لالہ کی طرح دیدہ زیب ہوتے ہیں، بعض اتنے نازک اور باریک کہ سوئی کے ناکے میں سے گزر جائیں۔ اسے محض شاعرانہ مبالغہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس عہد میں پارچہ بافی کی صنعت بہت ترقی کر چکی تھی۔ بنگال کے علاقے میں ایسی ململ تیار ہوتی تھی کہ دنیا بھر میں اس کی مثال دی جاتی۔ اور جو دیکھتا، حیران رہ جاتا۔ ڈھاکہ کی ململ ایسی نفیس اور باریک ہوتی کہ اس کا پورا تھان انگوٹھی کے چھلّے میں سے گزر سکتا تھا۔ یہ اتنی باریک ہوتی کہ اس کو سر پر لپیٹ لیا جاتا تو اس

کے اندر سے سر کے سارے بال دکھائی دیتے۔ اس کی ایک قسم شبنم کہلاتی تھی، اور اس کا نام اس لیے پڑا کہ اگر اسے گھاس پر رکھ دیا جاتا تو اس کا شفاف رنگ گھاس میں چھپ جاتا۔

کہا جاتا ہے کہ جب برصغیر پر قابض ہونے والے انگریزوں نے پہلی مرتبہ اس کپڑے کو دیکھا تو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں کر سکے اور کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے ہواؤں کے تار سے پریوں نے بنایا ہے مگر ان ہی انگریزوں کے ہاتھوں یہ صنعت تباہ ہوئی۔ انگلستان کے بنے ہوئے کپڑے کو فروغ دینے اور اپنی تجارتی بالادستی قائم کرنے کے لیے انھوں نے مقامی صنعت کی ہر ممکن حوصلہ شکنی کی اور جب کچھ بس نہ چلا تو ماہر فن کاری گروں کے انگوٹھے اور انگلیاں کٹوا ڈالیں کہ وہ کپڑا نہ تیار کر سکیں۔

اسی طرح بنارس کے ریشمی کپڑے، خصوصاً ساڑھیوں اور کشمیر کی گرم شالوں کی بھی دور دور تک شہرت تھی۔ یہ شہرت آج تک قایم ہے۔

کپڑے کی اقسام کی طرح، پرانے زمانے کے لباس بھی مخصوص تھے، اور اس زمانہ کے رسم و رواج سے وابستہ تھے۔ مثلاً اب سے چند برس پہلے تک، بڑوں کے سامنے ننگے سر آنے کو بدتہذیبی سمجھا جاتا تھا۔ کیا بچے، کیا بڑے، سبھی ٹوپی پہنتے تھے۔ کئی طرح کی ٹوپیاں رائج تھیں۔ اسی طرح عورتیں، غیر مردوں کے سامنے بے حجاب نہیں آتی تھیں، اور اپنے چہرے اور جسم پر برقع اوڑھ لیتی تھیں۔ اگر برقع نہ ہوتا تو دوپٹے سے گھونگھٹ نکال لیتیں۔

مردوں میں ٹوپی کے علاوہ، سر پر پگڑی باندھنے کا رواج بھی رہا ہے۔ نوابوں اور بادشاہوں کی پگڑی میں جواہرات ٹنکے ہوئے ہوتے۔ علماء کی پگڑی عمامہ کہلاتی ہے اور بادشاہوں کی پگڑی، دستار۔ پگڑی

صرف سر پر پہننے کا کپڑا نہیں، بلکہ عزّت اور وقار کی اہمیت سمجھی جاتی رہی۔ پگڑی کی یہ اہمیت دہلی کے سلاطین سے لے کر آج تک قائم ہے۔

مغلوں کے دور میں جامے کا رواج تھا، جو گھٹنوں تک یا اس سے اور ذرا نیچے تک سلوایا جاتا۔ مغل دربار میں جامہ نیم آستیں یا نیم تنہ کا رواج تھا۔ یہ آدھی آستین کا لباس تھا، جس میں سامنے کی طرف گھنڈ یاں لگی ہوئی ہوتیں۔ اس میں گریبان کے بجائے دو کنارے ہوتے، جو "پردہ" کہلاتے اور سینے کو ڈھانک لیتے۔ نچلے حصّے کو کھُلا رکھتے اور کمر کے پاس اسے ایک اور لباس سے جوڑ دیتے جو ٹخنوں تک آتا، اس میں چُنٹ دی جاتی اور اس کا گھیر بڑا سا ہوتا۔ جامے سے انگرکھا بنا۔ انگرکھے میں گریبان بھی ہوتا تھا اور اس میں گلے کے نیچے ایک پٹّی سی ہوتی جو دوسری طرف گردن کے پاس ایک گھنڈی یا تکمے سے اٹکا دی جاتی۔ اس کی آستینیں چُنّٹ والی ہوتیں، اور دامن نیچے تک آتا۔ اچکن اور شیروانی اسی انگرکھے کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں۔

کمر کے گرد پٹکا بھی باندھا جاتا۔ اس پر سونے چاندی کا کام یا نقاشی ہوتی۔ موزے پہننے کا رواج عام تھا۔

عورتوں میں دوپٹّے کا رواج بہت پُرانا ہے۔ پرانے زمانے کا دوپٹّہ تین گز کا ہوتا۔ سر پر اوڑھا جاتا اور گھٹنوں تک آتا۔ ملکہ نور جہاں نے دوپٹّے کی ایک قسم "اوڑھنی" ایجاد کی جو زیادہ لمبی نہ ہوتی اور بہت ہلکی ہوتی۔ عورتوں کے لباس میں کئی طرح کے پاجامے شامل تھے۔ بعض ڈھیلے ڈھالے ہوتے جو ٹخنوں پر چنّٹ دے کر باندھ دیے جاتے۔ بعض تنگ مہری کے ہوتے جن کا گھیرا اوپر سے ڈھیلا ڈھالا ہوتا۔ ایک زمانے میں اتنی تنگ مہری کے پائنچوں کا رواج ہو گیا کہ پہننے کے بعد مہریاں کس کر سی لی جاتیں اور اُتارتے وقت ٹانکے توڑنے کی ضرورت پڑتی۔ بعد میں گھیر دار پاجامے کی

جگہ کلیوں والے پاجامے کا رواج ہو گیا۔ اس کے بعد غرارہ مقبول ہوا۔ بعض مرتبہ غرارہ اتنا گھیر دار ہوتا کہ کنیزیں اس کو اُٹھائے رہتیں۔
عورتوں کے لباس میں عام طور سے بیل بوٹے، کشیدہ کاری، گوٹا ٹھپا، کام دانی، کارچوبی یا زردوزی کا کام ضرور ہوتا۔ اس وجہ سے یہ لباس عام طور سے قیمتی ہوتے تھے۔ زیور اور سنگھار اس کے علاوہ ہیں۔

کیل اور ہتھوڑی

کیل اور ہتھوڑی میں گہرا تعلق ہے۔ کیل لکڑی کا سینہ چیر دیتی ہے۔ لکڑی کے تختوں کو آپس میں پیوست کر دیتی ہے۔ اگر کیل ادھر اُدھر ہونے لگے تو ہتھوڑی اُسے سیدھا کر دیتی ہے۔ ہتھوڑی کی چوٹ سے کیل یا لکڑی میں یا دیوار میں اندر تک جاتی ہے۔ کیل اور ہتھوڑی دونوں مل کر تعمیر کو ممکن بناتے ہیں۔
ایک دن، ما قبل تاریخ کے آدمی نے ہڈّی پر لگا ہوا گوشت کھانے کے بعد، ہڈّی کے اندر کا نرم گوشت کھانے کے لیے پتھر کا ٹکڑا اٹھا لیا۔ اور ہڈّی پر دے مارا۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ انسان نے اس طرح سے کچلنے والا اوزار استعمال کرنا شروع کیا۔
انسان کو جلد ہی یہ اندازہ ہو گیا کہ کسی چیز کو کچلنے یا توڑنے کے لیے پتھر ہاتھوں سے زیادہ بہتر ثابت ہوتے ہیں، اور اس طرح چوٹ بھی نہیں لگتی۔

شروع میں تو یہ ہوا کہ جیسا پتھر مل گیا، اٹھا لیا اور اسے کام میں لے آئے۔ مگر اس کے بعد پتھروں کو چُن چُن کر مناسب اور مضبوط ٹکڑے تلاش کیے جاتے اور اس وضع کے پتھر نہیں ملتے تو انسان نے ان پتھروں کو اپنی خواہش اور ضرورت کے مطابق ڈھالنا سیکھ لیا۔ پتھروں کو تراش کر ایسا بنا لیا جاتا کہ پکڑنے میں آسانی ہو، اور پھر بھی اتنے مضبوط رہیں کہ ان سے زوردار ضرب لگائی جا سکے۔ ایسے پتھر ہتھوڑے کی پہلی شکل تھے۔

پتھر کے ان ہتھوڑوں سے کام لینا کوئی آسان نہیں تھا۔ انھیں سنبھال کر پکڑنا، اور اس طرح چوٹ لگانا کہ پورا وار پڑے اور ہاتھ نہ چھلنے پائیں، اس کے لیے خاصی مہارت اور مشق کی ضرورت تھی۔ جو لوگ یہ ہنر سیکھ لیتے وہ کاری گر بن جاتے۔ ان ہی کاری گروں نے وہ ابتدائی اوزار ڈھالے جن سے دنیا کے پہلے کسانوں نے زمین میں بیج بوئے اور فصل اُگائی۔

یہ سارے ضروری اور لازمی اوزار ان کاری گروں کے تجربات سے تخلیق ہوئے۔ ان ہی میں سے کسی کاری گر نے پتھر کے ہتھوڑے کو چمڑے کے تسموں اور گھاس کی تیلیوں کے ذریعے لکڑی کے ایک ٹکڑے سے باندھ دیا۔ کچھ عرصے کے بعد کسی اور کاری گر نے پتھر میں سوراخ کر کے لکڑی کا ٹکڑا اس میں پھنسا دیا۔ اب ہتھوڑے کو دستہ مِل گیا، اور اُسے اٹھانا، پکڑنا، اس سے کام لینا آسان ہو گیا۔

ہتھوڑے کے ساتھ نت نئے تجربے ہوتے رہے۔ لوگوں کو یہ اندازہ ہو گیا کہ دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر استعمال کیے جانے والے ہتھوڑوں کی چوٹ زیادہ زوردار ہوتی ہے، اور چوٹ کا دارومدار دستے کی لمبائی اور شکل پر ہوتا ہے۔

ہتھوڑے نے اپنا لوہا منوا لیا، اور اپنی افادیت کا احساس دلا دیا۔ ہتھوڑے کے استعمال کی مشق ہوئی تو تعمیر کو ترقی ملی۔ گھر، عمارتیں،

مقبرے اور عبادت گاہیں۔ ان سب کی ابتدا ہتھوڑے کے استعمال سے ہوئی۔ قدیم بابل کی عبادت گاہیں اور مصر کے اہرام اس چھوٹے سے ہتھوڑے کے بغیر بن نہیں سکتے تھے۔ اس سادہ سے اوزار کی بدولت ہی یہ شاندار عمارتیں وجود میں آئیں۔

ان عمارتوں میں استعمال ہونے والے پتھروں کی تراش خراش ہتھوڑے کے ذریعے ہوئی۔

جب انسان نے دھات دریافت کرلی، تو یہ ہتھوڑا ہی تھا جو ان کو ٹھونک پیٹ کر استعمال کے قابل بناتا۔

ہتھوڑے کے استعمال بدلتے گئے کہ ہتھوڑے کی شکلیں بھی بدلتی گئیں۔ موچی، لوہار، سنار، بڑھئی، معمار اور کان کن ـــ سب محنت کشوں کے پاس اپنے اپنے استعمال کے ہتھوڑے ہونے لگے، جو کسی نہ کسی مخصوص کام کے لیے بنائے گئے تھے۔ گھروں میں عام استعمال کے لیے جو چھوٹا اوزار بنایا گیا، اسے ہتھوڑا کہا جانے لگا۔

صدیوں کے سفر میں ہتھوڑی نے بہت سی شکلیں بدلی ہیں، مگر اس کی ضرورت میں کوئی کمی نہیں آئی۔

مشینوں اور طرح طرح کے آلوں کے اس دور میں ہتھوڑی کی اہمیت آج بھی باقی ہے۔ انجینیر اور مکینک، مرمّت کرنے والے اور تعمیر کرنے والے سبھی اسے استعمال کرتے ہیں۔ ہتھوڑی نے اپنا کام نہ دکھایا ہوتا اور زمین کی تہہ اور خلا کی وسعت کے سربستہ راز، انسان پر یوں شاید نہ کھلے ہوتے۔

ہتھوڑی کی ساتھی کیل ہے۔ یہ نہ ہو تو ہتھوڑی کی کاری گری ادھوری ہے۔ یہ چھوٹی سی ہے، مگر گھنی اور مضبوط ہے۔ ہتھوڑی کی مار اپنے سر پر سہتی ہے، اور گہری اتر جاتی ہے۔

کیل بھی پُرانے زمانے کی دریافت ہے۔ ہزاروں برس پرانی آشوری

تہذیب کے کھنڈروں سے لوہے کی کیلیں ملی ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں کیل استعمال ہوتی تھی۔ قدیم مصر کے کارکن اور دست کار، لکڑی اور دھات کی کیلیں استعمال کرتے تھے۔ قدیم روم کے سپاہی اپنے جوتوں میں کیلیں لگا لیتے تھے تاکہ جوتے زیادہ عرصے تک چل سکیں۔ ازمنۂ وسطیٰ کے یورپ میں محل اور قلعے کے دروازوں پر کیلیں ٹھونک لی جاتی تھیں کہ دروازے کی لکڑی کو اور مضبوط کر دیں۔

کیل بظاہر بڑی صابر معلوم ہوتی ہے مگر دوسروں کو تکلیف دینے کا کام بھی خوب جانتی ہے۔ پرانے زمانے میں صلیب پر چڑھانے کی سزا عام تھی۔ مجرم کے ہاتھ اور پاؤں میں بڑی بڑی کیلیں، جنھیں میخ کہا جاتا ہے ٹھونک دی جاتی تھیں۔ یورپ میں لوگوں سے اقبال جرم کرنے اور انھیں اذیت پہنچانے کے لیے ایک بھیانک طریقہ اختیار کیا گیا۔ ایسے لوگوں کو لوہے یا دھات کے پنجرے نما ڈبّے میں بند کر دیا جاتا جن کے اندرونی حصّے پر تمام کیلیں جڑی ہوئی ہوتیں۔ انھیں "دوشیزۂ فولاد" کہا جاتا۔ کیل کی یہ چبھن آج بھی محسوس ہوتی ہے!

کیل کا استعمال بڑھتا گیا اور اس کے ساتھ کیل کی قسمت بھی۔ پرانے زمانے میں کیل ہاتھ سے بنائی جاتی تھی، اس لیے بہت قیمتی سمجھی جاتی تھی۔ راہ چلتے، سڑک پر کیل مل جائے تو لوگ اسے اٹھا کر احتیاط سے رکھ لیتے۔ سترھویں صدی میں گھوڑا گاڑی اور کوچ پر کیلوں سے آرایش کی جاتی اور ایسی کوچ کو بہت خوب صورت سمجھا جاتا۔

مغلیہ دور کی عالی شان عمارتوں کی تعمیر میں بھی کیل نے اپنا کردار ادا کیا ہے۔ ایک پرانی روایت ہے کہ مغل شہنشاہوں نے ان عمارتوں میں سونے چاندی کی کیلیں جڑی تھیں۔ پھر وہ وقت آ گیا کہ تاریخ کے ہاتھوں نے اس سلطنت کو انجام پر پہنچا کر آخری کیل ٹھونک دی۔ یوں کیل، عروج اور زوال دونوں کی گواہ ہے۔

پلنگ

پلنگ ہمارے رات دن کا ساتھی ہے۔ یہ نہ ہو تو رات کی نیند اور دن کا آرام دو بھر ہو جائے۔ نرم گدیلا بستر نیند کے وقت ہمیں سُلاتا ہے، اور دن کے وقت سستانے کا موقع دیتا ہے۔ ہم اس پر لیٹ جاتے ہیں تو یہ ہمیں نیند کی وادیوں کی سیر کراتا ہے۔ اس سیر سے ہم تازہ دم ہو کر اُٹھتے ہیں تاکہ پھر دن بھر اپنے کام کاج میں مصروف رہیں۔ تھک جائیں یا بیمار پڑ جائیں تو پھر اس کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اس کی بدولت ہمیں نیند کا سکون میسّر آتا ہے اور یہی ہمارے خوابوں کا شریک بن جاتا ہے۔ بچپن کے جھولنے اور پنگوڑے سے لے کر آخر زندگی کے بستر مرگ تک، یہ زندگی کے ناٹک کا اسٹیج بھی ہے۔ ہمیں احساس بھی نہیں ہوتا کہ ہماری زندگی کا کتنا بڑا حصّہ پلنگ پر گزر جاتا ہے۔

پلنگ اور بستر کی جو سہولت آج ہمیں میسّر ہے، وہ بہت پرانے زمانے کے لوگوں کو حاصل نہیں تھی۔ ابتدائی زمانے کے لوگ کہیں ٹک کر نہیں بیٹھتے تھے، آج یہاں، کل وہاں اُن کا کوئی مستقل ٹھکانا نہیں تھا۔ دن شکار کی تلاش میں گزرتا۔ رات ہو جاتی تو کسی چٹان کے ساتھ یا درخت کے نیچے پناہ ڈھونڈتا۔ وہ گھاس پھوس یا پتّوں کے ڈھیر کو اپنا بستر بناتا، یا نرم پودوں پر لیٹتا۔ خالی زمین پر لیٹنا مشکل کام تھا۔

جب شکار کرنے والے، کھیتی باڑی کرنے لگے تو بستر نے بھی ایک باقاعدہ شکل اختیار کرنا شروع کی۔ فرش کے اوپر گھاس یا بھوسے کو بچھا لیا جاتا اور لوگ ان پر سو جاتے۔ جانوروں کی کھال، یا تھیلے میں بھوسے کو بھر دینے سے پہلا گدّا بنا۔

بارش کے دنوں میں یا سیلابی علاقوں میں لوگ احتیاط کی وجہ سے اپنا بستر، پتھر کی اُبھری ہوئی سلوں پر یا لکڑی کے مچان پر بچھاتے۔ جلد ہی یہ ہوا کہ لکڑی کے اس مچان کی جگہ ایک ڈھانچے نے لی جس میں پائے لگا دیے گئے تاکہ اسے ہلانا اور اٹھانا آسان ہو۔ یہ ڈھانچہ پہلا پلنگ بن گیا۔

یورپ کے قبائلی باشندے اپنے لیے معمولی صندوق سے بنوا لیتے، جن میں گھاس اور پتے بھر لیتے، اور رات کو ان ہی میں سو جاتے۔ اس سے بہت پہلے قدیم مصر میں پلنگ کا رواج پڑ چکا تھا۔ مصر کے لوگ سر کے نیچے رکھنے کے لیے لکڑی کے ٹکڑے استعمال کرتے تھے۔

قدیم یونان میں لیٹنے کے لیے کوچ یا پلنگڑی بہت مقبول تھی۔ یونانیوں کے برخلاف قدیم روم میں پلنگ اور مسہریوں کا دستور تھا۔ یہ پلنگ تانبے کے بنے ہوئے ہوتے اور ان پر خوب نقش و نگار ہوتے۔ غریب غرباء کے لیے پھر بھی بھوسے یا پیال پر لوٹ لگانا عام تھا۔ پلنگ اس زمانے میں بہت مہنگے تھے، کیوں کہ بڑی مہارت سے بنائے جاتے تھے۔ اس لیے اس زمانے تک یہ قیمتی اثاثہ سمجھے جاتے تھے۔

ازمنہ وسطیٰ کے قلعے اور محلات، روشنی اور گرمی کا مناسب انتظام نہ ہونے کی وجہ سے نم اور ٹھنڈے رہا کرتے تھے۔ جاڑے کی کسی رات کمرے کی نمی سے بچنے کے لیے کسی امیر نے اپنے پلنگ کے چاروں طرف پردے لگوا لیے۔ ان کو اتنا پسند کیا گیا کہ پھر بستر کے چاروں طرف تنی ہوئی چادر

عام ہوگئی۔ جلد ہی بستر کے اوپر شامیانے کی طرح کی چھت بھی پڑنے لگی، اور پلنگ چھوٹا موٹا خیمہ بن گیا۔

سردی کے زمانے میں تو یہ پلنگ ایسی آرام کی جگہ بن جاتا کہ اُسے چھوڑنے کو جی نہ چاہتا۔ لوگ پورا پورا دن اس میں گزار دیتے۔ بلکہ بعض بادشاہ یہیں لیٹے لیٹے دربار بھی منعقد کر لیتے۔

پلنگ زمین سے اونچے بنائے جا رہے تھے اور رفتہ رفتہ اتنے اونچے ہوگئے کہ سترھویں صدی میں پلنگ پر چڑھنے کے لیے چھوٹی سی سیڑھی استعمال ہوتی، نیچے جو خالی جگہ بچتی، اس میں بچوں کو لٹایا جاتا۔

پہلے پہل بھیڑوں کی کھال اور سمور سے گرمائی حاصل کی جاتی، کیونکہ لحاف عام نہیں ہوئے تھے۔ پھر بطخ کے پروں سے بھری ہوئی چادر سے رضائی کا کام لیا جانے لگا۔ ہر شہر میں بطخیں، مرغابیاں اور قاز پالے جاتے کہ ان سے پر حاصل کیے جا سکیں۔

لحاف اور پلنگ نے بہت سی شکلیں اختیار کی ہیں، مگر اب بھی دنیا کے مختلف ملکوں میں الگ الگ دستور ہیں۔ افریقہ کے دیہات میں سونے کے لیے چٹائی استعمال ہوتی ہے۔ لاطینی امریکہ کے انڈین باشندے جھولن کھٹولا استعمال کرتے ہیں جس میں ایک چادر، دو درختوں یا دو کھمبوں کے درمیان تانی جاتی ہے، بستر کا بستر اور جھولے کا جھولا۔

ہمارے ملک میں پرانے زمانے میں پلنگ، چھپر کھٹ اور مسہریاں استعمال ہوتی تھیں۔ بادشاہوں کے پلنگ، چھپر کھٹ اعلا درجے کے مرصّع ہوتے اور ان پر جواہرات جڑاؤ ہوتے۔ پلنگ کے پائے یا تو خالص سونے چاندی کے ہوتے، یا لکڑی کے پائے پر سونے چاندی کا خول چڑھا دیا جاتا۔ یہ پلنگ نواڑ سے بُنے جاتے۔ اس نواڑ کے بارے میں کتابوں میں لکھا ہے کہ یہ ریشم کی طرح ملائم، نرم اور چمکدار ہوتی۔

جس پلنگ کے اوپر چھتری اور پوشش ہوتی، وہ چھپر کھٹ کہلاتا۔ رنگین کپڑوں سے سجے ہوئے چھپر کھٹ، شادی بیاہ کے موقعے کے لیے تیار کیے جاتے۔

اونچے پائے والی اور چوڑی چوڑی مسہری، پلنگ سے بڑی ہوتی۔ اس کا رواج امیروں میں زیادہ ہوتا۔ عوام میں چارپائی مقبول تھی۔ ہلکی پھلکی آسانی سے اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے والی اور سستی۔ یہ بان یا رسّی سے بُنی ہوئی ہوتی تو بان پر پانی چھڑک کر انھیں ٹھنڈا کر لیا جاتا۔ پرانے بادشاہوں کے زمانے سے لے کر آج تک، چارپائی مقبول چلی آ رہی ہے۔ ہمارے ملک میں اس کا رواج عام ہے۔ لوگوں کی اکثریت اب بھی چارپائی پر سوتی ہے۔

کُرسی

چلتے چلتے یا کھڑے کھڑے تھک جائیں تو جی چاہتا ہے کہ کہیں بیٹھ جائیں۔ ایسے میں کُرسی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ایسا لگتا ہے کہ مہربان اور آرام دہ کرسی آغوش کشادہ کیے ہوئے ہے۔ اس پر بیٹھ کر ہم اطمینان کا سانس لیتے ہیں۔

لیکن یہ کُرسی ہمیشہ سے موجود نہ تھی۔ بہت پرانے زمانوں میں، جب لوگ ایک جگہ ٹک کر نہیں رہتے تھے اور ان کے گھر "اٹھاؤ چولھا" قسم کے تھے کہ آج یہاں کل وہاں، تو بیٹھنے کے لیے کرسی کا کوئی تصوّر

نہ تھا جب بیٹھنے کی ضرورت پڑتی تو فرش پر پھسکڑا مار کر بیٹھ جاتے۔ اٹھنے، بیٹھنے اور لیٹنے کے لیے زمین کافی تھی۔

مگر جلد ہی بیٹھنے کے معاملے میں فرق کیا جانے لگا۔ جوں جوں سماج کی ایک شکل بنتی گئی، تو اس میں لوگوں کے درجے متعیّن ہونے لگے۔ کچھ لوگ سردار اور محترم ٹھہرے، اور کچھ کو نچلے درجے دیے گئے۔ جو سردار اور محترم قرار پائے، وہ زمین سے اونچے ہو کر بیٹھنا پسند کرنے لگے۔

اونچے درجے کی نشانی کے طور پر قبیلے یا جتھے کے سردار کو ایسی جگہ پر بٹھایا جانے لگا جہاں بیٹھ کر وہ نمایاں ہو سکے۔ باقی سارے لوگ زمین پر بیٹھتے تو سردار کو پتھّر کی چٹان پر بٹھایا جاتا۔

قبیلوں اور جتھوں نے بستی کی شکل اختیار کی اور بستیوں کے سردار، بادشاہ بن گئے تو ان کے بیٹھنے کی جگہ بھی بلند تر ہوتی گئی۔ بادشاہ جس چیز پر بیٹھتے تھے اسے شاہی تخت کہا جانے لگا، اور یہ تخت بادشاہ کے رعب و دبدبے، طاقت اور مرتبے کی علامت بن گیا۔ شاہی تخت سے سلطنت مراد لی جانے لگی۔

اقتدار میں آتے ہی کرسی کے دن پھر گئے۔ تخت کے سامنے کس کی مجال تھی کہ ٹھہرتا؟ بادشاہ بیٹھا رہے اور باقی سارے لوگ کھڑے رہتے۔ قدیم آشوریہ کے سامنے بادشاہ نے اپنے شاہی تخت میں دو پہیے لگوا لیے تھے۔ تاکہ وہ اٹھے بغیر جہاں چاہے جا سکے۔ برصغیر کے مسلمان بادشاہوں کے دربار میں تمام درباری اُمرا کھڑے رہتے۔ صرف خاص خاص اشخاص کو بیٹھنے کی اجازت تھی۔ دربار میں بیٹھنے کی اجازت یا کرسی ملنا بڑے اعزاز کی بات سمجھی جاتی تھی۔

بادشاہوں کے تخت، زر و جواہر سے مزیّن ہونے اور ان کی طرح

طرح سے آرائش کی جاتی۔ مغل شہنشاہ شاہجہاں کا تخت طاؤس کاری گری کا ایسا ہی نمونہ تھا، جس کی خوبصورتی کی آج تک مثال دی جاتی ہے۔ درباری امرا کے بیٹھنے کے لیے بھی طرح طرح کی مسندیں، چوکیاں اور نشستیں بنائی جاتی تھیں۔ قدیم تہذیبوں میں یہ کرسیاں قیمتی لکڑی کو تراش کر بنائی جاتیں، ان کے پائے اور ہتھے شیر یا بیل کی شکل کے ہوتے اور یہ خیال کیا جاتا تاکہ جو ان پر بیٹھے گا وہ ان جانوروں کی سی طاقت حاصل کرلے گا۔

کرسیوں کا رواج سب سے پہلے مصر کے دولت مند لوگوں میں ہوا۔ کرسی دربار سے نکل کر امرا کے گھروں میں آگئی۔ قدیم مصر کی یہ کرسیاں دیکھنے میں بہت خوب صورت لگتیں، ان میں بناوٹ کا کام ہوتا اور ان کی پشت انسانی کمر کے لحاظ سے بنائی جاتی۔ یہ آرام دہ اور دلکش کرسیاں آج اعلا فرنیچر کی کسی بھی دکان میں مہنگے داموں فروخت ہوسکتی ہیں اور کسی بھی جدید ڈرائنگ روم کی آرائش میں اضافہ کرسکتی ہیں۔ پاؤں رکھنے کے لیے مصریوں نے چھوٹے چھوٹے اسٹول بنائے۔ ان اسٹولوں کو دشمن فوج کے سپاہیوں کی شکل کا بنایا جاتا۔ اس طرح وہ دشمن کے خلاف تلوار اٹھائے بغیر اسے اپنے قدموں تلے روندنے کا مزہ حاصل کرسکتے تھے۔ مصریوں نے تہہ ہو جانے والی کرسیاں بھی بنالی تھی۔ ایک دستور یہ بھی تھا کہ بچے کرسیوں پر بیٹھنے کے بجائے چمڑے کے گدّوں پر بیٹھتے۔

قدیم یونان اور روم میں بچے، اسٹولوں پر بیٹھنے لگے۔ کرسی اساتذہ خواتین اور اہم شخصیات استعمال کرتی تھیں۔

جب چوتھی صدی عیسوی میں نیم وحشی قبائل کے ہاتھوں روم برباد ہوگیا تو رہائش کی یہ سہولیات، مغرب کے ملکوں سے غائب ہوگئیں۔ عام آدمی بیٹھنے کے لیے معمولی انداز کی بنچیں اور اسٹول بلکہ بڑے صندوق

بھی استعمال کرنے لگے۔ کرسی پر بیٹھنا صرف بادشاہوں، امرا اور گرجا کے بڑے پادریوں کا حق تھا۔ قدیم انگلستان کے نیم روایتی بادشاہ آرتھر کے جنگجو سورما ایک گول میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھتے تھے اس لیے انھیں "گول میز کے سورما" کہا جاتا تھا۔ اہم مجلس میں صرف سب سے معزز شخص کو کرسی پر بیٹھنے کی اجازت ہوتی تھی، اور اسی لیے اجلاس کے سربراہ کو آج بھی چیئرمین (یعنی کرسی بردار) کہا جاتا ہے۔

تجارت اور جہازرانی کے فروغ سے یورپ میں دولت کی فراوانی ہوئی تو گھروں میں آسایش کے سامان کا استعمال بڑھنے لگا۔ کرسیاں عام طور پر استعمال ہونے لگیں۔ اس زمانے میں جیسی کرسیوں کا دستور تھا وہ آج ہمیں بہت آرام دہ معلوم ہوں۔ ان کرسیوں کی پشت سیدھی اور تنگ تھی اور بیٹھنے کی جگہ تھوڑی سی تھی۔ کرسیوں کو آرام دہ بنانے کے لیے ان پر چمڑا منڈھ کر اس کے اندر گھوڑے کے بال یا کیل سے ٹھنکے ہوئے گدّے استعمال ہونے لگے۔

نت نئے نمونوں کی کرسیاں بننے لگیں۔ کچھ پر جھالر اور پھندنے ہوتے۔ کچھ پر نقش و نگار۔ اب کرسی بیٹھنے کی ہی نہیں، دیکھنے کی چیز بھی تھی۔

دو سو برس پہلے یورپ میں بغیر ہتھے کی کرسیاں سامنے آئیں، جن پر دو آدمی اطمینان سے بیٹھ کر بات چیت کر سکتے تھے۔ گدّے والی کرسیوں نے ترقی کر کے زیادہ آرام دہ اور گدیلے صوفوں کی شکل اختیار کر لی۔

کرسی اور صوفے کو ہمارے معاشرے میں آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا مگر ہم لوگ ان کو دولت اور اعلا معیارِ زندگی سمجھنے لگے ہیں۔ مونڈھے اور پیڑھی پر بیٹھنا عام تھا۔ لکڑی کی بنی ہوئی، چار پایوں والی چھوٹی سی پیڑھی عام تھی۔ کرسی کے بجائے عام طور سے مونڈھے

استعمال ہوتے۔ یہ سینٹھے یا سرکنڈے سے بنائے جاتے اور ان کو آرام دہ بنانے کے لیے بکری کی کھال یا کپڑا لگا دیا جاتا۔ تخت اور چوکیاں عام تھے۔ بڑی بڑی مجالس میں فرشی نشست ہوتی تھی۔ دری اور چاندنی بچھ جاتی اور لوگ گاؤ تکیوں سے ٹیک لگا کر بیٹھتے۔

پہلے پہل تخت کے آگے رکھی جانے والی چوکی کو کرسی کہا جاتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ انگریزی وضع کی کرسی استعمال ہونے لگی۔ کسی گھر میں یا گانو میں کوئی معزز مہمان آجاتا تو کہیں سے مانگ تانگ کر کرسی لائی جاتی اور مہمان کو بیٹھنے کے لیے پیش کی جاتی۔ اب گھروں اور دفتروں میں اس کا استعمال عام ہے۔

کرسی نے کئی شکلیں بدلی ہیں۔ جھولنے والی کرسی، گھومنے والی کرسی، بند ہو جانے والی کرسی عام طور پر دیکھنے میں آتی ہیں۔ سینما گھروں میں ایسی کرسیاں ہوتی ہیں جو اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتیں۔ بڑے بڑے سرکاری دفتروں میں رعب دار، لمبی چوڑی کرسیاں نظر آتی ہیں۔ ایسی کرسیاں اپنے بیٹھنے والوں سے بھی زیادہ بارعب اور مضبوط معلوم ہوتی ہیں۔

میز

کرسی اور میز، دونوں کا نام اکثر ساتھ لیا جاتا ہے۔ حالاں کہ دونوں اپنی جگہ مکمل ہیں، اور ایک پوری چیز ہیں، پھر بھی ایک کا تصور دوسرے سے اس طرح وابستہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہوئی نظر

آتی ہیں۔ اس لیے کرسی کے بعد میز کی باری تو آنا ہی تھی۔

جب میزیں عام نہیں ہوئی تھیں تو لوگ فرش پر بیٹھ کر کھانا کھایا کرتے تھے۔ کرسی نے یہ طریقہ بدل دیا۔ کرسیوں کی موجودگی میں صاحب مرتبہ لوگوں کو یہ بات اپنے وقار اور حیثیت کے منافی معلوم ہوئی کہ زمین پر سے جھک جھک کر کھانا اٹھائیں۔ اس لیے کھانے کی چیزوں کو لکڑی کے تختوں پر چُن دیا گیا جہاں سے انھیں اٹھانا آسان تھا۔ اب کرسی پر بیٹھ کر کھانا آسان ہو گیا۔ جن تختوں پر کھانا کھایا کرتے تھے وہ بڑھتے بڑھتے کھانے کی میزیں بن گئے۔

قدیم زمانے میں صرف امرا اور رؤسا میزیں استعمال کرتے تھے۔ مصر اور یونان کے پرانے معاشروں میں یہ دستور تھا کہ بڑی بڑی میزوں کے بجائے مہمانوں کو چھوٹی چھوٹی، الگ الگ میزوں کے سامنے بٹھایا جاتا۔ اس کے برخلاف روم میں مہمان آرام دہ تخت پر نیم دراز ہو جاتے اور ان کے سامنے سنگِ مرمر کی لمبی چوڑی میزیں بچھی ہوتیں جن پر سے وہ اپنی پسند کی غذائیں اٹھا کر کھاتے۔ کھانا پکانے کے دوران باورچی خانے کی میز استعمال کرنے کا طریقہ بھی اسی دور میں پڑا۔

ہمارے معاشرے میں کھانے کی میز کا رواج زیادہ پرانا نہیں۔ میز کی آمد سے پہلے دسترخوان بچھایا جاتا اور سب لوگ اس کے گرد بیٹھ جاتے۔

کھانے کی میز کے علاوہ لکھنے کی میز عام ہے۔ پرانے زمانے میں لکھنے کی میز نہیں ہوتی تھی۔ مصر، یونان اور روم کے قدیم معاشروں میں لوگ تختی یا جس چیز پر لکھ رہے ہوتے، اسے اپنے گھٹنوں پر یا گود میں رکھ کر لکھتے، پڑھتے وقت بھی تختی کو اسی طرح جما لیتے۔ اس وقت کتابیں، تختی یا گول گول موڑے ہوئے مسوّدوں کی شکل میں ہوتی تھیں

کتاب کو جس شکل میں ہم جانتے ہیں وہ ازمنۂ وسطیٰ کے دور میں قایم ہوئی اس وقت کتابوں کے سرورق، لکڑی یا دھات کے بنے ہوئے ہوتے، اور ایک کتاب کا وزن کئی سیر ہوتا۔ ایسی کتاب کو گود میں رکھ کر پڑھنا ممکن نہیں تھا۔ ایسی کتابوں کا بوجھ اٹھانے کے لیے لکڑی کے سہارے استعمال کیے جاتے، اور ان سہاروں کو میز پر رکھا جاتا۔ ہمارے ہاں ایسی قیمتی یا قابلِ تعظیم کتابوں کو رکھنے کے لیے رحل استعمال ہوتی آئی ہے۔

کتابوں کو رکھنے والے سہارے کو ذرا سا ترچھا کر کے مناسب لمبائی، کا بنا دیا گیا تو کتابوں کا اسٹینڈ بن گیا جو پرانے زمانے کے علماء کے لیے لکھنے کی میز کا کام بھی دیتا تھا۔ اس پر لکڑی کے ایک اور تختے کا ڈھکنا بھی لگا دیا تھا تو اس کے اندر کاغذ اور قلم رکھنا آسان ہوگیا۔ اس میں پائے اور دراز میں بھی لگا دی گئیں تو لکھنے کی میز تیار ہوگئی۔

اٹھارویں صدی میں لکھنے کی میز پر نیم بیضوی ڈھکنے ٹکانے کا رواج عام ہوگیا جو تہ ہوجاتے تھے۔ ایسی میزوں میں اہم کاغذات رکھ کر تالا لگایا جاسکتا تھا۔ لکھنا پڑھنا تہذیب کی اہم ترین نشانی سمجھا جانے لگا، اور اپنے پڑھے لکھے ہونے کا ثبوت دینے کے لیے لوگ لکھنے کی میزیں گھروں میں رکھنے لگے۔

اس زمانے میں کئی طرح کی میزیں سامنے آنے لگیں، ورنہ روم کے زوال کے صدیوں بعد بھی، میزیں صرف بہت امیر لوگوں کے ہاں استعمال ہوتی تھیں۔ کھانے کی میز لکڑی کے ایک تختے سے زیادہ نہ تھی، جس میں پایے کے بجائے قینچی دار بیٹھک ہوتی، کھانا کھانے کے بعد میز کا تختہ الگ ہوجاتا اور بیٹھک کو الگ ایک طرف رکھ دیا جاتا۔ میز کے اوپری تختے میں جگہ بنی ہوتی، جس میں کھانا نکالا جاسکتا تھا اور رکابیوں کی ضرورت نہیں رہتی۔

اٹھارویں صدی میں میز کو مقبولیت حاصل ہونا شروع ہوئی۔ امیروں کے گھر میں اعلا درجے کی، عمدہ میزیں رکھی جاتیں۔ کھانے کی میزیں بڑی بڑی ہونے لگیں۔ ماہرِ فن کاریگر میزوں کی آرایش کے لیے طرح طرح کی چیزیں تیار کرتے اور میز کو سجا دیا جاتا۔ اسی زمانے سے فرنیچر کا کاروبار چلا۔

لوگوں کا ذوق اور فیشن بدلنے لگا تو اس کے ساتھ فرنیچر بھی بدلا۔ میزیں بنانے والے طرح طرح کے نمونے سامنے لے کر آتے۔ بڑی ہو جانے والی میز سامنے آئی، جس کے بیچ میں ایک پٹرا لگ جاتا اور میز پھیل جاتی۔ سلائی کڑھائی کرنے والی خواتین کے لیے سینے کی میز سامنے آئی جس میں سوئی دھاگوں کے لیے الگ الگ خانے بنے ہوئے تھے۔ آسٹریا کی ملکہ کو اپنے سنگھار کا سامان رکھنے کی ضرورت ہوئی تو دربار کے کاریگروں نے میز پر آئینے لگا کر سنگھار میز بنائی جو جلد ہی ساری دنیا میں مقبول ہو گئی۔

اب کئی قسم کی میزیں استعمال ہوتی ہیں۔ کھانے کی میز، لکھنے کی میز، سینے کی میز اور سنگھار میز کے علاوہ۔ اسکول کے بچے جس ڈیسک پر بیٹھتے ہیں، دکانوں کا کاؤنٹر، کمپیوٹر، یا ٹی وی، وی سی آر رکھنے کا اسٹول اور مصوّروں، انجینیروں کا ڈرائنگ بورڈ، یہ سب میز کی مختلف شکلیں ہیں۔

میز بڑی دور سے آئی ہے اور اس نے بہت روپ بدلے ہیں۔

الماریاں اور صندوق

چیزوں کی کہانی میں ایک اہم حصّہ چیزوں کے رکھنے کا بھی ہے۔ جوں جوں انسان اپنی سہولت اور آرام کے لیے مختلف چیزیں بناتا گیا چیزوں کو سنبھال کر رکھنے کی اہمیت بھی بڑھتی گئی۔ چیزوں کی دریافت اور ایجاد کے ساتھ چیزوں کو رکھنے کے طریقے بھی دریافت ہوتے گئے۔

اگر چیزیں بکھری ہوئی ہوں اور بے ترتیب پڑی ہوں تو ہمیں بُرا لگتا ہے۔ ہم نے اپنی دانست میں ہر چیز کی ایک جگہ مقرّر کی ہوئی ہے اور استعمال کے بعد ہر چیز کو اس کے طے ہوئے مقام پر رکھ دیتے ہیں۔ اگر ہم ایسا نہ کریں تو اگلی دفعہ جب اس چیز سے کام پڑے تو بہت سا وقت اسے ڈھونڈنے میں صرف ہو جائے۔ اور پھر ادھر ادھر بکھری ہوئی چیزیں بھٹکتی پھرتی ہیں۔ نیستی میں آ جاتی ہیں اگر انھیں سنبھال کر نہ رکھا جائے تو خراب ہو جاتی ہیں، ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں۔ اور ٹوٹی پھوٹی چیزوں سے کام نہیں ہوتا، وہ بھلا کس کام کی؟ چیزیں اس بات کی متقاضی ہیں کہ ان کا خیال کیا جائے، انھیں احتیاط سے رکھا جائے۔ بکھری ہوئی چیزیں جگہ بھی زیادہ گھیرتی ہیں۔ اگر انھیں سمیٹ لیا جائے تو کم جگہ میں زیادہ چیزیں سما سکتی ہیں۔ اور ترتیب سے گنجائش بڑھتی ہے۔ چیزوں کے استعمال میں آسانی ہو جاتی ہے۔ اس طرح چیزوں کو اس طرح رکھنے سے ہمارے لیے سہولت ہو جاتی ہے۔

چیزوں کو رکھنا ایک سہولت ہی نہیں بلکہ ضرورت بھی ہے۔ یہ ضرورت آج سے صدیوں پہلے کے انسان نے بڑی شدّت کے ساتھ محسوس

کی تھی۔ پرانے زمانہ کے لوگوں کو چیزیں سنبھال کر رکھنے کی ضرورت اس لیے زیادہ پڑی کہ وہ غذا کی فراہمی کے لیے قدرت کے مظاہر مثلاً موسم پر تمام تر انحصار کرتا تھا۔ اس لیے جس زمانے میں غذا وافر ہوتی تو اس کا کچھ نہ کچھ حصّہ سنبھال کر رکھنا پڑتا تاکہ ان دنوں میں کام آئے جب کھانے کو کچھ نہ مل رہا ہو، کھانے کی جو چیزیں آسانی سے رکھی جا سکتی تھیں، مثلاً گری والے میوے اور پھل، وہ ایسی چیزوں میں رکھ دیے جاتے جو اس کام کے لیے آسانی سے استعمال ہو سکتی تھیں، مثلاً سوکھے ہوئے کدّو کا چھلکا، یا ناریل جس سے گودا نکال لیا گیا ہو۔ سوکھے ہوئے کدّو اور ترئی سے تونبی بنی جو آج تک استعمال ہوتی چلی آئی ہے۔ درختوں کے سوکھے تنے یا کھوکھلے ٹھنٹھ اور بانس کے خول بھی ان چیزوں کو رکھنے اور چھپانے میں کام آتے تھے۔

بانس، سرکنڈے اور نرکل نے ٹوکری کی شکل اختیار کر لی، اور کھانے پینے کی چیزیں اُن میں رکھی جانے لگیں۔ جب برتن بننے لگے تو اس وقت تک انسان زمین کو کاشت کرنا اور فصلیں اگانا سیکھ گیا تھا۔ اب غذا کی فراہمی، موسم کی اس طرح سے پابند نہیں رہی کہ جیسی شکار کے زمانے میں تھی۔ مگر اگلے وقت کے لیے غذا فراہم کرکے رکھنا، انسان کی فطرت میں داخل ہو گیا اور چیزوں کو رکھنے کی عادت پڑ گئی۔

رکھنے والی چیزوں کی تعداد بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ پہلے پہل ہر انسان کے پاس زیادہ سے زیادہ اوزار ہوتے جن کی مدد سے وہ شکار کرتا یا غذا حاصل کرتا۔ پھر ہر انسان کی ملکیت میں رہنے والی چیزوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ خاص طور پر وہ لوگ جو قبیلے کے سردار یا بستی کے بادشاہ ہوتے وہ لوگوں سے تحفے وصول کرکے یا جنگ میں ہارنے والوں

سے زبردستی چھین کر بہت ساری چیزوں کے مالک بن جاتے۔ ان کی دولت اور مال کا ذخیرہ خزانہ بن جاتا۔

ان خزانوں کو رکھنے کے لیے گودام اور اناج گھر بنوائے گئے۔ اناج کو چوہوں سے محفوظ رکھنے کے لیے بڑے بڑے مرتبانوں میں رکھا جاتا تھا۔ قدیم بابل میں تو یہ مرتبان شہر کے کتب خانے میں بھی استعمال ہوتے۔ کتابیں اور شاہی فرمان گول گول لپیٹ کر مرتبان میں رکھ دیے جاتے۔ قدیم مصر کے دولت مند گھرانوں میں بھی اناج رکھنے کے لیے گودام ہوتا' جہاں غذا کے برتن چھت سے لٹکا دیے جاتے تاکہ چوہوں کی پہنچ سے دور رہیں۔ اناج کے برتنوں کو لبالب بھر کے چکنی مٹّی سے بند کر دیا جاتا اور ان کے اوپر لکھ دیا جاتا تاکہ بعد میں معلوم ہو سکے کہ ان کے اندر کیا ہے۔ اس طرح ایک فصل کی پیداوار اگلی فصل تک استعمال ہو سکتی تھی۔ پہننے کے کپڑے اس طرح رکھے جاتے تھے کہ دھوپ اور ہوا لگتی رہے' اور انھیں تہ کر کے سرکنڈے کی بنی ہوئی پٹاریوں میں رکھا جاتا۔ باقی کپڑے دیوار میں بنی ہوئی الماری میں رکھے جاتے۔

مصر' یونان اور روم میں زیورات اور آرائش کی چیزیں بہت قیمتی ہوتی تھیں اور ان کو احتیاط سے رکھنا ضروری تھا۔ خواتین اپنے زیور اور سنگھار کی چیزیں خوب صورت اور نازک ڈبّوں میں رکھتی تھیں۔ یہ ڈبّے بھی بڑی کاریگری اور مہارت سے بنائے جاتے۔ چیز کے ساتھ ساتھ اس کو رکھنے والی چیز کی اہمیت بھی لوگوں نے محسوس کر لی تھی۔

کپڑے رکھنے کے لیے قدیم مصر میں فرعونوں کے زمانے سے ہی لکڑی کے صندوق استعمال ہونے لگے تھے۔ البتّہ قدیم یونان میں کپڑے ٹانگنے کے لیے دیوار پر بنی ہوئی کھونٹیوں سے کام لیا جاتا تھا۔ پرانی قوموں میں سے غالباً روم کے لوگوں نے سب سے پہلے الماری بنائی۔ روم

کی الماریوں میں پٹ لگے ہوئے تھے اور پایوں پر کھڑی ہوتی تھیں۔
مگر یہ الماریاں بھی سب کو کہاں میسّر تھیں! زیادہ تر گھروں میں یہ ہوتا تھا کہ دیوار میں ایک طاق تھا جس میں چیزیں رکھی جاتی تھیں۔ صرف بہت امیر لوگ ہی الماری یا صندوق رکھ سکتے تھے اور چونکہ زیادہ سازوسامان کا رواج نہیں تھا، اس لیے اس صندوق پر بیٹھا بھی جاتا اور اس پر کھانا چن کر میز کا کام بھی لیا جاتا۔

کتابیں بھی ان ہی صندوقوں میں رکھی جاتی تھیں۔ ازمنۂ وسطیٰ کے راہب اور علماء کتابوں کو دیوار میں بنی شیلف پر رکھنے لگے تاکہ کتابیں آسانی سے رکھی اور ضرورت کے وقت نکالی جاسکیں۔ اس سے پہلے شیلف کا زیادہ رواج نہیں تھا۔ مگر پھر امراء اپنے چاندی کے ظروف شیلف پر رکھنے لگے۔ تاکہ ہر آنے جانے والا انھیں دیکھے اور شیلف پر سجا کر وہ اپنی دولت اور مال وزر کی نمایش کرنے لگے۔

چاندی کے برتنوں میں سجا ہوا شیلف سترھویں صدی کے یورپ میں دولت اور سماجی مرتبے کی نشانی بن گیا۔ الماری کو بھی ایسی ہی علامت سمجھا جاتا تھا۔ یعنی بڑا آدمی وہ ہوا جس کی الماری بڑی ہے۔
مسلمان بادشاہوں کے عہد کے برصغیر میں محلوں کے اندر جس جگہ کپڑے اور پوشاک رکھے جاتے تھے، اس جگہ کو جامہ خانہ یا توشک خانہ کہتے تھے۔ زیادہ تر سامان صندوق میں رکھ کر بند کر دیا جاتا۔ صندوق عموماً لکڑی کے ہوتے، لیکن شاہی محل میں سنگِ مرمر اور آبنوس کے صندوق بھی ہوتے تھے۔

تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ تیمور کے پاس سونے کا ایک صندوق تھا۔ اس کا ڈھکنا بہت چوڑا تھا۔ صندوق کے اوپر نیلے اور ہرے شیشے اور دھات کے چھوٹے چھوٹے برج بنے ہوئے تھے، جن

میں ہیرے اور قیمتی جواہر جڑے ہوئے تھے۔ صندوق کھولا جاتا تو اس کے اندر اونچی جگہ پر پیالے نظر آتے تھے۔ پیالوں کے اوپر چھوٹے بڑے گنبد نظر آتے جن میں بھی ہیرے جواہرات اجڑے ہوئے تھے۔ بادشاہ کا یہ صندوق عجائبات کا صندوق ہوگا!

آج کل ہم بڑے بڑے صندوقوں کی جگہ دھات کے بکس استعمال کرتے ہیں۔ لکڑی کی الماریوں کے ساتھ ساتھ اسٹین لیس اسٹیل کی الماریاں بھی خوب استعمال ہوتی ہیں۔ کیوں کہ یہ مضبوط اور پائدار ہوتی ہیں۔

جس زمانے میں کتابیں، مسوّدوں کی شکل میں مرتبان میں رکھی جاتی تھیں، وہ کب کا گزر گیا۔ آج کل کتاب کو بک شیلف یا بُک ریک میں رکھا جاتا ہے۔ کاغذات ساتھ رکھنے کے لیے بریف کیس موجود ہیں، جن کی وجہ سے کاغذات لے کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے میں سہولت ہوگئی ہے، ایسے ہی بیگ اور کیس لے کر لوگ سفر پر بھی نکلتے ہیں، کیوں کہ ریل اور ہوائی جہاز کے سفر کے لیے یہ زیادہ مناسب ہیں۔

اور رہ گئیں کھانے پینے کی چیزیں تو پہلے اُنھیں چھینکے ہی میں لٹکا یا جاتا یا نعمت خانے میں رکھا جاتا تھا۔ جو چیزیں جلدی خراب ہو جانے والی ہوتی ہیں۔ اس کا یا تو مربّہ بنا لیتے، یا دھواں دے لیتے، یا سکھا کر رکھ لیتے۔ امریکہ کے سرخ ہندی باشندے ایسی چیزوں کو غاروں میں یا زمین سے نکلنے والے ٹھنڈے چشموں میں رکھ دیتے۔ بعض مرتبہ ایسی چیزوں کو برف پر بھی رکھ دیا جاتا۔

پھر رفتہ رفتہ یہ ہوا کہ سردی اور برف باری کے بعد جم کر برف بن جانے والی جھیلوں میں سے یخ بستہ پانی کے بڑے بڑے ٹکڑے توڑ لیے جاتے اور برف خانوں میں محفوظ رکھے جاتے۔ برف کے یہ ٹکڑے پانی کو ٹھنڈا اور کھانے پینے کی چیزوں کو کئی دن تک محفوظ رکھنے کے لیے

اتنے مفید ثابت ہوئے کہ ان کا کاروبار ہونے لگا۔ برف کو ڈبوں میں ڈال کر ان میں کھانا رکھا جاتا۔ کھانے کو ٹھنڈا کرنے والا یہ ڈبہ، یا "ٹھنڈی الماری" دراصل ریفریجیریٹر کی ابتدائی شکل ہے۔ فرج اور ڈیپ فریزر نے کھانے کی چیزیں محفوظ رکھنے کو بہت آسان بنادیا ہے۔

جھاڑو

بعض لوگ جھاڑو سے گھن کھاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جھاڑو اچھی بُری، صاف اور گندی ہر جگہ جاتی ہے۔ ہر چیز کو چھوتی ہے، اس لیے اس کے سائے سے بھی بچنا چاہیے کہ کہیں ہمارے لگ نہ جائے۔ لیکن بے چاری جھاڑو تو اپنا کام کرتی ہے۔ جھاڑو حلال کماتی ہے۔ ساری دنیا کی گندگی سمیٹ لیتی ہے۔ اگر جھاڑو اپنا کام نہ دکھائے تو اس دنیا میں ان لوگوں کا گزارا مشکل ہو جائے جو صفائی پسند کرتے ہیں اور جھاڑو سے گھن کھاتے ہیں۔

جب دنیا اتنی پرانی نہیں ہوئی تھی تو جھاڑو بھی دریافت نہیں ہوئی تھی۔ قدرت میں صفائی کا انتظام بارش اور ہوا کے سپرد تھا۔ جب لوگ گروہوں اور بستیوں میں رہنے لگے تو صفائی کی زیادہ ضرورت پڑنے لگی۔

غاروں میں رہنے والے ابتدائی زمانے کے لوگ اپنے رہنے اور بیٹھنے کے ٹھکانے کو صاف رکھنے کے لیے درختوں کے پتّے یا پرندوں کے پر سے

کوڑا کرکٹ سمیٹ دیتے۔ ان میں سے کسی نے درخت کے تنکے چن لیے اور انھیں ایک ساتھ باندھ کر ان سے کوڑا سمیٹا۔ ایک ساتھ بندھے ہوئے تنکوں سے جھاڑو بن گئی اور ان تنکوں کے ساتھ لکڑی بھی لگا دی گئی تاکہ دستہ بن جائے اور انھیں پکڑنے میں آسانی ہو۔

صفائی اور جھاڑو کی ضرورت غاروں کے زمانے میں ہی پڑ گئی تھی لیکن بہت عرصے بعد تک، جھاڑو کے استعمال کی نوبت کم ہی آئی۔ قدیم روم اور یونان میں سڑکوں اور گلیوں کی صفائی کا دستور نہیں تھا، اور ان میں گندگی کے ڈھیر لگے رہتے تھے۔ اس کے باوجود لوگ اپنے گھروں میں بہت صفائی رکھتے تھے۔ گھر میں جو بھی کوڑا کرکٹ جمع ہوتا، اٹھا کر باہر گلی میں پھینک دیتے۔ سڑکوں کی صفائی کا عرصہ دراز تک کوئی خیال نہیں رکھا گیا۔ ازمنۂ وسطیٰ کے یورپ میں بھی سڑکوں پر کوڑا بکھرا رہتا اور سوروں کے گلّے سڑکوں پر چھوڑ دیے جاتے کہ یہ کوڑا کرکٹ کھائیں۔

بعض مرتبہ لوگوں کو حکومت کی طرف سے مشورہ دیا جاتا تھا کہ گلیوں میں پانی کا چھڑکاؤ کریں، اور سڑکوں کو صاف رکھیں کیوں کہ اس وقت تک لوگوں کو اندازہ ہو چکا تھا کہ گندگی بیماریوں کو جنم دیتی ہے۔ کھلی ہوئی نالیوں کی وجہ سے گندگی میں اور اضافہ ہوتا تھا۔ اس زمانے میں یورپ میں وبائی بیماریوں کے متواتر حملے ہوتے رہے۔

لیکن سڑکوں کی صفائی کا یہ ناقص انتظام ساری دنیا میں یکساں نہیں تھا۔ بعض علاقوں میں سڑکوں اور گلیوں کی صفائی کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ ہزاروں برس پرانے شہر، موہن جوڈارو میں نالیاں بنی ہوئی تھیں اور گندے پانی کی نکاسی کا انتظام موجود تھا۔ قدیم ہندستان کے گھروں میں کوڑا جمع کرنے کے لیے خاص جگہیں بنی ہوئی تھیں، اور سڑکوں کو گرد و غبار سے صاف رکھا جاتا تھا۔ قدیم آزٹیک شہروں میں یہ دستور

تھا کہ نہروں میں خاص بجرے موجود رہتے جن میں کوڑا جمع کیا جاتا۔ مسلمان خلفاء کے دور میں اسلامی دنیا میں شہروں کی صفائی کی دیکھ بھال کے لیے سرکاری افسر متعین تھے۔ اس عہدے کی بڑی قدرومنزلت تھی۔

اس بات کو سو، ڈیڑھ سو برس سے زیادہ کا عرصہ نہیں گزرا کہ سڑکوں اور شہری علاقوں کی صفائی کے لیے جھاڑوئیں استعمال ہونے لگیں۔ تنکوں اور بالوں سے بنی ہوئی جھاڑو کو "برش" کہا جاتا ہے، اور اگر اس میں لکڑی کا دستہ لگا دیا جائے تو وہ "بروم" بن جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں یہ خیال تھا کہ چڑیلیں اور جادوگرنیاں، رات کے اندھیرے میں ان ہی جھاڑوؤں پر بیٹھ کر اُڑتی پھرتی ہیں۔

سڑکوں کی صفائی کا اب زیادہ اہتمام ہوتا ہے۔ بعض شہروں میں جھاڑو کا کام کرنے والی مشینیں ہیں۔ بعض شہروں میں پرانے طریقے سے سڑکیں دُھلتی ہیں۔ آج یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ صفائی صحت کے لیے لازم و ملزوم ہے، اور اگر شہروں، بستیوں کو صاف نہ رکھا گیا تو لوگوں میں بیماری پھیلنے کا خطرہ رہتا ہے۔

یونان اور روم کے مہذب معاشروں میں سڑک کی صفائی پر زور نہیں دیا جاتا تھا۔ لیکن گھروں کو بہت صاف ستھرا رکھا جاتا تھا، اور ان کی صفائی پر بڑی محنت کی جاتی تھی۔ یونان کے امراء کے گھروں میں فرش اور دیواریں سنگِ مرمر کی ہوتی تھیں، اور اسفنج پر لکڑی کے لمبے لمبے دستے لگا کر ان کو صاف کیا جاتا۔ روم کے امراء کے ہاں دستور تھا کہ صبح کی گھنٹی بجتے ہی نوکروں اور غلاموں کی فوج صفائی شروع کر دیتی۔ وہ صفائی کے لیے کھجور اور پام کے پتّے استعمال کرتے۔

ازمنۂ وسطیٰ کے یورپ میں گھر کی صفائی پر بھی اتنا زور نہیں دیا نہیں دیا جاتا تھا۔ قلعے اور محل کے فرش پر سرکنڈے یا بھوسہ بچھا دیا

جاتا اور یہ بھوسا سال کے سال ہی بدلا جاتا۔ بدبو کو روکنے کے لیے خوشبودار پتیاں بکھیر دی جاتیں۔ سترھویں صدی کے آخر تک، ڈچ لوگ ہی یورپ کی واحد قوم تھے جو باقاعدگی سے اپنے گھروں کو دھو دھلا اور جھاڑ پونچھ کر صاف رکھتے تھے۔

کیا شہر اور کیا دیہات، ہمارے پرانے معاشرے میں بھی گھروں کی صفائی پر بڑا زور دیا جاتا تھا۔ گانو میں جہاں کچی مٹی کے گھر ہوتے تھے، دیواروں پر مٹی کا لیپ کر کے صاف رکھا جاتا تھا۔ بعض علاقوں میں یہ دستور ہے کہ صبح سویرے گھر کو صاف ستھرا کر کے دہلیز پر چاک سے خوب صورت اور رنگین نقش و نگار بنا دیے جاتے ہیں۔ ان نقش و نگار کو "رنگولی" کہتے ہیں۔

ہمارے ہاں دو طرح کی جھاڑوؤں کا رواج ہے۔ پھول جھاڑو اور تنکے والی جھاڑو۔ یہ دونوں جھاڑو ئیں درختوں اور پودوں سے حاصل ہوتی ہیں۔ قالین صاف کرنے کے برش اور ویکیوم کلینر نئی ایجادات ہیں جنھوں نے صفائی کو زیادہ آسان بنا دیا ہے۔

صابن

جو بچّے نہانے دھونے سے گھبراتے ہیں، وہ یہ معلوم کر کے حیران رہ جائیں گے کہ دنیا میں ایسے بھی لوگ موجود ہیں جو کبھی نہیں نہاتے۔ دنیا کے بعض علاقوں اور معاشروں میں نہانے کا رواج نہیں ہے۔ یہ

بات زیادہ پُرانی نہیں ہوئی۔ تبت میں کیا امیر کیا غریب، کیا عورت، کیا مرد، کیا چھوٹا کیا بڑا، کبھی بھی نہاتا نہیں تھا۔ ان لوگوں کے لیے نہانے کا تصوّر ہی عجیب سا تھا۔ قطب شمالی کے یخ بستہ برفانی علاقوں میں رہنے والے اسکیمو بھی صفائی کے لیے پانی کے استعمال سے گھبراتے تھے۔ اور تو اور، پچھلی صدی تک امریکہ کے بعض علاقوں میں لوگ اسی وقت نہاتے تھے جب ڈاکٹر انھیں نہانے کا مشورہ دیتا تھا۔

کچھ لوگ پانی سے نہانا پسند کریں یا نہ کریں، لیکن تاریخ کے ہر دور میں اور تقریباً ہر قوم کے افراد نے کسی نہ کسی طریقے سے اپنے آپ کو صاف ستھرا رکھنے کی کوشش کی ہے۔

پانی سے نہانے سے تو ہم سب بخوبی واقف ہیں۔ بعض علاقوں میں بھاپ سے نہانے کا رواج رہا ہے۔ قدیم ازٹیک باشندے، فن لینڈ کے لوگ اور ترکی کے باشندے نہانے کے لیے یہ طریقہ اختیار کرتے کہ گرم کیے ہوئے پتھروں پر ٹھنڈا پانی ڈالتے اور اس سے جو بھاپ نکلتی تو اس میں اپنے جسم کو صاف کر لیتے۔ ایسے غسل خانوں کو حمّام کہا جاتا تھا ترکی میں یہ طریقہ اتنا مقبول تھا کہ یورپ اور امریکہ کے لوگ بھاپ سے نہانے کے اس طریقے اور ایسے غسل خانوں کو "ترکی غسل" کہنے لگے۔ اس مقصد کے لیے بنائے جانے والے بڑے بڑے غسل خانوں کو "سونا" SAUNA بھی کہتے ہیں۔

قدیم آشوریہ کے دولت مند صبح سویرے اٹھ کر اپنے جسم پر تیل کی مالش کر لیتے تھے اور اسی کو کافی سمجھتے تھے۔ اس کے برخلاف مصر میں ابتدائی زمانے سے ہی غسل خانے استعمال ہوتے آئے تھے، اور ہر گھر میں نہانے کی جگہ موجود ہوتی تھی۔ یونان کے لوگ روزانہ نہانے کے عادی تھے۔ وہ نہانے کے ساتھ ساتھ، ہاتھ اور پاؤں رگڑ رگڑ کر صاف

کرتے اور اس مقصد کے لیے جھانوے استعمال کرتے تھے۔ اس کے بعد وہ خوشبودار مسالے لگاتے تھے۔ بعض لوگ پودوں سے نکلنے والے جھاگ دار مادّے سے نہاتے تھے۔

فرانس کے علاقے میں ہزاروں برس پہلے بسنے والے قبائلیوں نے صفائی کے لیے ایک نئی اور بڑی کارگر چیز ڈھونڈھ نکالی۔ وہ بکری کی چربی، چکنی مٹّی اور پوٹاش کو ملا کر استعمال کرتے تھے۔ اس چیز کا نام انھوں نے "ساپو" رکھا تھا جس سے آج کا لفظ سوپ نکلا ہے۔ یہ صابن کی ابتدائی شکل تھی، مگر اس کا استعمال عام نہیں ہونے پایا۔ ان قبائلیوں کے بنائے ہوئے صابن سے روم کے لوگ بھی واقف تھے، مگر وہ اس کے استعمال کے قائل نہیں تھے۔

اس زمانے میں صاف پانی کی فراہمی بہت بڑا مسئلہ تھی۔ اونچی نالیوں کے ذریعے روم کے معمار عام حمّام تک پانی لے کر جاتے تھے۔ یہ حمّام قدیم روم کے معاشرے میں بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ معمولی سی رقم ادا کر کے کوئی بھی شہری حمّام میں داخل ہو سکتا تھا اور اس کی سہولتوں سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ آپ چاہیں تو گرم پانی کے تالاب میں تیریے، نہائیے یا مالش کروائیے۔ جی چاہے تو انتظار کے کمروں میں کوئی کھیل کھیلیے یا کتاب پڑھ لیجیے۔ اور اگر کچھ بھی نہ کرنے کو جی چاہے تو حمّام کے گرد پھیلے ہوئے باغوں میں دھوپ کھائیے۔

روم کے زوال کے ساتھ ساتھ حمّام بھی ختم ہو گئے۔ ایسا لگتا تھا کہ مغربی دنیا نے نہانے دھونے کا تکلّف ہی اٹھا دیا ہے۔ ازمنۂ وسطیٰ کے یورپ میں لوگ نہائے بغیر ہی کام چلاتے تھے۔ لیکن ہر پادری کو باقاعدہ ہاتھ اور مُنھ صاف کرنا پڑتا، اور ہر کرسمس اور ایسٹر کے دن نہانا ضروری تھا۔ باقی امراء یہ کرتے کہ لکڑی کے بڑے سے حوض میں بیٹھ جاتے،

اور پانی کی دو چار بالٹیاں اپنے اوپر گروا لیتے۔

مغرب میں نہانے کا رواج دوبارہ جو پھیلا تو صلیبی جنگوں میں حصہ لینے والے فوجیوں کی وجہ سے پھیلا جنھوں نے مشرق وسطیٰ میں آکر نہانے کی عادت اختیار کرلی۔ مشرق کے ملکوں میں نہانے کا رواج زیادہ پُرانا تھا۔ ہندوؤں کے رسم و رواج میں اشنان کرنے یعنی نہا دھو کر صاف ہونے کو اہمیت دی جاتی ہے۔ مسلمان نماز پڑھنے کے لیے دن میں پانچ دفعہ وضو کرتے آئے ہیں۔

صلیبی جنگوں کے ان سپاہیوں نے ازمنۂ وسطیٰ کے یورپ کو نہانے سے متعارف کرایا۔ بہت سے عام حمّام شہروں میں بنوائے گئے جہاں شہر کے لوگ اجتماعی طور پر نہاتے۔ نہانا، یورپ میں اتنا مقبول ہوا کہ فیشن بن گیا اور امراء اپنے پانی کے حوض میں بیٹھے بیٹھے ہی مہمانو سے ملاقات بھی کر لیتے۔

کچھ لوگ تو ایسے بھی تھے جن کے لیے پانی سے نہانا کافی نہیں تھا۔ بعض مشہور بادشاہ شراب سے نہاتے، اور تاریخ میں ایک آدھ ایسی ملکہ کا ذکر بھی ملتا ہے جو دودھ سے نہاتی تھی۔

تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ کلیسا اتنی زیادہ صفائی کو پسند نہیں کرتی تھی اور سترھویں صدی میں ڈاکٹروں نے بار بار نہانے کو صحت کے لیے خطرہ قرار دے دیا اس لیے نہانے کا فیشن خود بخود ختم ہو گیا۔

اس زمانے میں پانی کی ہر بالٹی کے لیے تالاب یا کنویں کا پھیرا کرنا پڑتا تھا۔ اس لیے پانی کی کفایت کے مارے لوگوں نے نہانا کم کر دیا۔ اٹھارویں صدی تک یہ حال تھا کہ امرا بھی مُنہ دھونے یا نہانے کے زیادہ قائل نہیں تھے۔ بس کوئی گیلا کپڑا کبھی کبھار مُنہ پر پھیر لیتے۔ عطر

اور پاؤڈر خوب لگاتے تاکہ جسم سے بو نہ آئے۔

دھیرے دھیرے خوب اچھی طرح مُنہ دھونے اور نہانے کا رواج پڑ گیا۔ چھٹّی والے دن نہا دھو کر آگ کے سامنے بیٹھنے کا دستور ہو گیا اور اکثر گھریلو مسالے اور صابن صفائی کے لیے استعمال ہونے لگے۔ انیسویں صدی تک ہر گھر میں مُنہ دھونے کے لیے پانی سے بھرا برتن اور تسلہ رہتا تھا۔

برصغیر میں پانی کی فراوانی بھی رہی ہے اور صفائی کے لیے نہانا دھونا لازمی سمجھا جاتا رہا ہے۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے "ہندستان کے مسلمان حکمراں کے عہد کے تمدنی جلوے" میں لکھا ہے کہ ہندو مرد اور عورتیں زیادہ تر کھلی فضا اور بہتے پانی میں نہانا پسند کرتیں، جب کہ مسلمان اپنے گھروں میں نہانے کے لیے بند جگہ بنواتے اور اس طرح غسل خانہ کا رواج مسلمانوں کی آمد کے بعد ہوا۔

شاہی وقت کی عمارتوں اور قلعوں میں بڑے بڑے حمّام بنے ہوئے ہیں۔ خوب صورت آرایش سے مزیّن ان حمّاموں میں ٹھنڈے اور گرم دونوں طرح کے پانی کا اہتمام تھا۔ دہلی کے لال قلعے میں جو حمّام ہے، اس کے تین درجے ہیں۔ پہلے درجے میں کپڑے بدلے جاتے ہیں اور دوسرا درجہ سرد خانہ کہلاتا ہے جس کے بیچ میں حوض ہے اور چاروں طرف فوّارے۔ تیسرا درجہ گرم خانہ کہلاتا ہے اس کا ایک کمرہ "گرم آبہ" کہلاتا ہے، جو ایک توے کے ذریعے گرم رہتا تھا۔ حمّام میں جا بجا نہریں تھیں اور فوّاروں کے ذریعے ہر کمرے میں پانی پہنچتا تھا۔

بادشاہوں کے علاوہ عوام کے لیے بھی حمّام موجود تھے۔ ازمنہ وسطیٰ میں حمّام موجود تھے اور حمّام میں غسل کرنے والوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ مغلوں کے شہر میں صرف آگرہ شہر میں آٹھ سو حمّام تھے جن میں حکیم

ابوالفتح گیلانی کا حمام بہت مشہور تھا۔

صابن کا ذکر اکبر بادشاہ کے زمانے میں بھی ملتا ہے، لیکن نہانے کے لیے صابن اچھے نہیں سمجھے جاتے تھے۔ بلکہ کپڑے دھونے میں استعمال ہوتے تھے۔ نہانے کے لیے ہڑ، آملہ، صندل استعمال کیے جاتے۔ عورتیں ملتانی مٹی سے سر دھوتیں۔ نہانے میں خوشبودار مسالے استعمال ہوتے اور سر میں تیل لگانے کا عام رواج تھا۔

اب سے پچاس، پچھتر برس پہلے کا ذکر کرتے ہوئے شاہد احمد دہلوی نے لکھا ہے کہ: "کھلی منہ ہاتھ دھونے کے کام آتی تھی۔ کھلی، ابٹنے اور بیسن کے زمانے کبھی کے لد گئے۔ اب تو طرح طرح کے صابن ہیں، جن سے جلد کو نقصان تو پہنچ سکتا ہے، فائدہ مطلق نہیں پہنچتا۔ عورتیں آنولوں، ریٹھوں، ملتانی مٹی، سیکا کائی اور دہی سے بال دھویا کرتی تھیں۔ ان سے بال بڑے اور چمک دار ہو جاتے تھے۔

کھلی، بیسن اور اُبٹن کا رواج تقریباً ختم ہو گیا ہے، اور غسلخانہ میں صابن کی حکمرانی ہے۔

رسّی

رسّی ہوتی تو پتلی سی ہے، مگر ایسا مضبوط بندھن باندھتی ہے کہ گرہ لگ جاتی ہے اور دھن کی اتنی پکّی کہ جل جاتی ہے مگر بل نہیں چھوڑتی۔

رسّی ہو یا سُتلی، دیکھنے میں بڑی معمولی لگتی ہیں۔ مگر کتنے بہت

سے کام کر گزرتی ہیں۔ رسّی باندھنے کے کام آتی ہے، اور بندھ جانے کے بعد کھینچتی ہے اور گھسیٹتی ہے، جس چیز سے بندھ گئی ہے اسے موڑ سکتی ہے، گھما سکتی ہے، پھیر سکتی ہے اور اپنے پیچھے پیچھے اونچائی پر چڑھا سکتی ہے۔ یہی رسّی الگنی بن جاتی ہے اور گھر بھر کے کپڑے دھو کر سکھانے کے لیے رسی پر پھیلا دیے جاتے ہیں اور جب یہ رسّی دو اونچائیوں کے درمیان تن جاتی ہے۔ تو بازی گر اور تماشہ دکھانے والے اس پر چل کر تماشائیوں کی داد حاصل کرتے ہیں۔ رسّی ان بازی گروں کو توازن قائم رکھنے میں مدد دیتی ہے۔ رسّی کا ایک شریک کار تار ہے۔ اگر تار اپنا کام نہ کریں تو نہ بجلی آئے نہ ٹیلی فون کام کرے، بڑے بڑے کارخانے اور اہم صنعتیں ٹھپ ہو جائیں۔ اس تار میں واقعی بجلی بھری ہوتی ہے۔

بہت پرانے زمانے کے لوگ درختوں پر چڑھنے کے لیے بیلیں استعمال کرتے تھے۔ بیل کے سہارے سے اب بھی لوگ درخت پر یا دیوار پر چڑھ جاتے ہیں۔

یہ بیلیں قدرتی رسّی کا کام دیتی تھیں اور اس قدرتی رسّی کے ذمے بہت سے کام تھے۔ اس میں لٹکا کر غذا اور جلانے کی لکڑیاں گھر لے جانا آسان ہو جاتا تھا۔ اس کا جال بنا کر جانوروں کو پکڑا جا سکتا تھا اور اس کو باندھ کر بھاری چیزوں کو گھسیٹنا ممکن ہو جاتا تھا۔ اس زمانے میں گوند، لئی اور کیلیں دریافت نہیں ہوئی تھیں۔ اس لیے گھاس، ریشے اور درختوں کی چھال سے رسّی کا کام لیا جاتا۔ کلہاڑی اور نیزے کی ابتدائی شکل اسی طرح بنی، اور ان اوزاروں اور ہتھیاروں نے انسان کی زندگی میں سہولت پیدا کی۔

جلد ہی انسان نے مختلف چیزوں سے رسّی بنانا سیکھ لیا۔ جانوروں

کی کھال کی جھلّی سے کمان کا چلّہ بنایا گیا۔ اسے بھی رسّی اور تار کی ایک شکل سمجھنا چاہیے۔

بابل اور مصر کے قدیم معمار جب مندر اور اہرام تعمیر کروانے لگے تو غلاموں کے گروہ پتھر لانے پر معمور تھے۔ پتھروں کی کان سے وہ پتھروں کی سلیں اور چٹانیں نکالتے اور پہیے والی گاڑیوں پر گھسیٹ کر عمارت کی تعمیر کی جگہ تک لے کر جاتے۔ پتھروں سے بھری ان گاڑیوں کو رسّی سے کھینچتے تھے۔ بھاری چیزوں کو گھسیٹنے میں اس وقت آسانی پیدا ہوگئی جب زنجیر پیدا ہوگئی اور لوہے کی کڑیوں نے مل کر حلقے بنا لیے۔ یہ زنجیر اور بھی مضبوط ثابت ہوئی۔ رسّی تو صرف باندھتی تھی، یہ گرفتار کر لیتی ہے۔

قدیم روم میں رسّی سے بڑا فائدہ اٹھایا گیا، اور اس سے بہت کام لیے گئے۔ کان کنی میں یہ لوگوں اور ان کے اوزاروں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے میں کام آتی، اور جنگ کے دوران پتھر پھینکنے والی منجنیق میں کام آتی۔ روم کے لوگوں نے چرخیاں اور آہنجر ایجاد کیے۔ جن سے بوجھ اُٹھانے میں بہت مدد ملتی۔ چرخی کے ذریعے بوجھ اٹھانے کا اصول آج تک کام آرہا ہے۔

رسّی نے پُل بھی بنائے۔ گہری کھائیوں اور شور مچاتے ندی نالوں کے اوپر رسّی کے پُل بنائے گئے۔ پاکستان کے انتہائی شمالی علاقوں، چترال، گلگت اور بلتستان میں رسّی کے پُل جا بجا بنے ہوئے ہیں۔ جب یہ ہلتے اور ڈولتے ہیں تو ان پر سے گزرنے والوں کا دِل ڈوب سا جاتا ہے، لیکن یہ اتنے مضبوط ہیں کہ یہ لکڑی کے جن تختوں کو سہارتے ہیں ان پر سے گاڑی گزر جاتی ہے۔

رسّی میں جب گرہ لگائی جانے لگی تو رسّی کے اور بھی فائدے

سامنے آئے۔ گرہ، رسّی کو پھسلنے سے روک دیتی ہے اور بندھن کو مضبوط کر دیتی ہے۔

گرہ صرف باندھنے کے کام ہی نہیں آتی، بلکہ اس کے اور بھی بہت سے فائدے ہیں۔ جنوبی امریکہ کے انکا، گرہ والے دھاگوں سے گنتی اور پیغام رسانی کا کام لیتے تھے۔ مختلف رنگ، حجم اور دھاگے میں جگہ کے حساب سے ہر گرہ کا ایک خاص مطلب تھا۔ کسی کو پیغام بھیجنے کا یہ طریقہ تھا کہ اس کو گرہ والا دھاگا بھیج دیا۔

روس کے دیہاتی گرہ باندھتے تھے، کیوں کہ ان کے خیال میں اس ٹوٹکے سے بھیڑیے، پالتو جانوروں کے گلّے پر حملہ نہیں کریں گے۔

امریکا کے سرخ ہندی رسّی میں گرہ باندھ کر اس سے دنوں کا حساب بھی رکھتے تھے۔ ہمارے ہاں بھی، عورتیں ہر سال دھاگے میں ایک گرہ لگا کر اپنے بچّوں کی عمر کا حساب رکھتی تھیں۔ "سال گرہ" کا لفظ اسی رسم سے نکلا ہے۔

بحری جہازوں پر سفر کرنے والے ملّاحوں کے لیے رسّی، زندگی کی ایک اہم ضرورت تھی۔ ملّاحوں نے کئی طرح کی گرہیں باندھنے کے طریقے دریافت کیے۔ کشتی اور جہاز کے مستول باندھنے سے لے کر بادبان کو سہارا دینے تک، ملّاحوں کے کام کا بہت بڑا حصّہ رسّی کے سہارے انجام پاتا۔ بحری جہازوں میں رسّی نے بہت جوہر دکھائے۔

رسّی کی ضرورت بڑھی تو اس کو بنانے کے طریقے بھی بہتر ہونے لگے۔ مختلف قسم کے ریشوں کو بٹ کر رسّی بنانے کا جو طریقہ رائج ہوا وہ آج تک چلا آ رہا ہے۔ ضرورت کے مطابق ریشوں کی تعداد بڑھا کر رسّی کو موٹا کیا جا سکتا ہے۔

رسّی کے پھندے بھی بنتے ہیں۔ گھوڑے پر بیٹھ کر، رسّی کے پھندے

سے جانوروں کو پکڑنے والے کاؤ بوائے بہت مانوس ہیں۔ ہم سب نے انھیں امریکی فلموں میں رسّی گھماتے ہوئے دیکھا ہے۔ ہمارے ہاں بھی رسّہ گیر اپنی ہوشیاری کے ذریعے مسافروں کو لوٹتے اور چھوٹے موٹے جرائم کرتے رہے ہیں۔ رسّی کی مضبوطی کا یہ ناجائز استعمال ہے

گھڑی

ایک وقت ایسا تھا کہ انسان کا سروکار صرف شکار اور پناہ گاہوں کی تلاش تھی۔ اتنا شکار کرتے کہ پیٹ بھر جائے اور ایسی جگہ جہاں حفاظت سے رات گزاری جاسکے۔ لیکن جب وہ ایک مقام پر بس گیا اور کام کاج شروع کردیا تو وقت کی پیمائش ضروری ہوگئی۔ وقت، رات اور دن میں تو تقسیم تھا ہی، اب دن کو پہروں اور گھنٹوں میں تقسیم کرنے کی ضرورت پڑ گئی۔

وقت کا سب سے بڑا پیمانہ تو سورج تھا۔ دن ڈھلنے اور وقت گزارنے کا حساب اس بات سے رکھا جاتا تھا کہ سورج کہاں پر ہے۔ وقت کو ناپنے کے لیے پہلی گھڑی بھی سورج کے لحاظ سے بنائی گئی۔ یہ دھوپ گھڑی، گھنٹوں کا حساب رکھتی تھی اور سورج کے سائے کے لحاظ سے وقت بتاتی تھی۔ گھٹتے بڑھتے سائے کے حساب سے وقت بتانے والی دھوپ کے ساتھ مشکل یہ تھی کہ رات کے وقت یہ بے کار ہو جاتی تھی، جن دنوں بادلوں کی وجہ سے سورج نہ دکھائی دیتا تو دھوپ گھڑی بھی رُک جاتی۔ اس لیے لوگوں نے وقت کی پیمائش کے اور طریقے ڈھونڈنا شروع کردیے۔

قدیم یونان اور روم میں آبی گھڑی بہت مقبول تھی۔ یہ گھڑی کیا تھی۔ ایک برتن تھا جس میں ایک چھوٹا سا سوراخ تھا اور سوراخ سے پانی نکلتا رہتا۔ پانی کے نکلتے رہنے سے برتن کے خالی ہو جانے کی مدّت معلوم تھی۔ جب برتن خالی ہو جاتا تو معلوم ہوتا کہ اتنا وقت گزر چکا ہے۔

اس کے بعد شمع گھڑی کا رواج ہوا۔ یہ موم بتی تھی جس پر مختلف نشان لگے ہوتے تھے۔ ایک نشان سے دوسرے نشان تک شمع کے پگھلنے کا مطلب تھا کہ ایک گھنٹہ گزر گیا یعنی موم بتّی کا جلنا اور پگھلنا وقت کا گزرنا تھا۔

اس سے زیادہ سستا اور قابل اعتماد ذریعہ ریت گھڑی تھی۔ یہ گھڑی شیشے کی ایک نلکی تھی جو درمیان سے اتنی پتلی تھی کہ دو حصّوں میں بٹی ہوئی نظر آتی۔ اوپر کے حصّے میں ریت بھری ہوئی تھی، جو نیچے گرتی رہتی اوپر کے حصّے کے بالکل خالی ہو کر نیچے کے حصّے کے بھر جانے میں پورا گھنٹہ لگتا تھا۔ جب گھنٹہ پورا ہو جاتا، اوپر کی تمام ریت نیچے پہنچ جاتی، تو ریت گھڑی کو اُلٹا کر لیا جاتا، اور ریت کا گرنا دوبارہ شروع ہو جاتا۔

ریت گھڑی کا رواج اس وقت کم ہوا جب کل پرزوں کی بنی ہوئی گھڑیاں عام ہو گئیں۔

ایسی گھڑیوں کے عام ہونے میں بہت وقت لگا، اور ایک عرصے تک انھیں عجوبہ سمجھا جاتا رہا۔ خلیفہ ہارون رشید نے فرانس کے بادشاہ ولیمن کو تحفے میں بہت خوب صورت گھڑی بھیجی تو اس کا سارا دربار گھڑی کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔

یورپ میں کل پرزوں کی گھڑی بارہویں صدی میں نمودار ہوئی۔ لوہاروں کی بنائی ہوئی یہ گھڑی کچھ ایسی ٹھیک نہیں تھی، مگر اس سے تھوڑا بہت کام لیا جانے لگا۔

۱۳۰۶ء میں اطالیہ کے شہر میلان میں پہلی مرتبہ گھنٹے کی ٹن ٹن سنائی

دی تو اسے بڑا اہم واقعہ سمجھا گیا اس کا مطلب یہ تھا کہ اب محض سن کر لوگ یہ بتا سکتے ہیں کہ کیا وقت ہوا ہے۔

جلد ہی عوام کی سہولت کے لیے شہروں کے اہم مقامات پر بڑے بڑے گھنٹہ گھر تعمیر کیے گئے۔ بعض شہروں میں جو گھنٹہ گھر بنائے گئے وہ فن تعمیر کا بھی اور ماہرانہ کاریگری کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ ہر گھنٹے پر سپاہیوں کی قطار یا تاریخی ہستیوں کی شبیہ نکل کر بتاتی کہ گھنٹہ پورا ہو گیا ہے۔ لوگ انھیں دیکھتے اور وقت کا اندازہ لگا لیتے۔

لوگ اب بھی دور دور سے آکر ان گھنٹہ گھروں کو دیکھتے ہیں۔ یہ معلوم کرنے کے لیے نہیں کہ اب کیا وقت ہوا ہے، بلکہ ایک گزرے ہوئے وقت کے آثار کے طور پر۔

لوہاروں نے ابتدا میں جو گھڑیاں بنائی تھیں، وہ بڑی اور بھاری تھیں اور پہیوں کے گرد گھومنے والے وزن سے چلتی تھیں۔ ان کو بہتر بنانے کے لیے کام ہوتا رہا۔ بھاری وزن کے لیے اسپرنگ استعمال ہوا تو گھڑی کا چھوٹا کرنا ممکن ہو گیا۔ پنڈولم لگائے گئے تو گھڑی کی رفتار بہتر ہو گئی اور منٹ بتانے والی چھوٹی سوئی کے اضافے سے اب گھڑیاں، گھنٹوں کا حساب رکھنے کے بجائے منٹ منٹ کا حساب رکھنے لگیں۔

گھنٹوں کے بجائے چھوٹی گھڑیاں بننے لگیں، اور ان کا سنبھالنا آسان ہو گیا تو ان کا استعمال بھی بڑھ گیا۔ اب ہر شخص چاہتا تھا کہ اس کے گھر کی دیوار پر ایک گھڑی ضرور لٹک رہی ہو۔ گھڑی سازی اہم کام بن گئی۔

پہلی باقاعدہ گھڑی، جرمنی کے ایک قفل ساز نے ۱۵۰۰ء کے لگ بھگ بنائی۔ یہ گھڑی کالر کی بیضوی شکل کی تھی، اور گلے میں ہار کی طرح پہنی جاتی تھی یا کالر کے گرد لٹکائی جاتی تھی۔ اس گھڑی نے جلد ہی ایک زیور کی صورت اختیار کر لی۔ مشہور و معروف سنار اور دست کار

ان گھڑیوں کو طرح طرح کے نمونوں میں بناتے اور سونے چاندی کے کام پر جواہرات جڑتے۔ یہ گھڑی کیا تھی، فن پارہ تھی اور ایک گھڑی کا مالک ہونا بڑی بات تھی۔ جن لوگوں کی طبیعت میں دکھاوا ہوتا، وہ ایک ہی وقت میں کئی گھڑیاں پہنتے۔ گھڑیاں الگ الگ شکلوں کی ہوتی ہوں گی، مگر ان سب میں وقت ایک ہی سا ہوتا ہوگا۔

ایک گھڑی بنانے کے لیے ایک ماہر اور ہنرمند کاریگر کو بہت وقت درکار ہوتا تھا۔ پچھلی صدی میں صنعتی ترقی کی بدولت یہ ممکن ہوا کہ اتنی قیمت کی گھڑیاں بننے لگیں کہ ایک آدمی کی دسترس میں ہوں۔ گھڑی زیور کے بجائے ضرورت کی چیز بن گئی۔ مگر پھر بھی گھڑی بہت قیمتی ملکیت سمجھی جاتی تھی۔ سونے کی زنجیر سے لٹکی ہوئی، ڈبیا کی طرح کھلنے والی اور چابی سے چلنے والی جیبی گھڑیاں، اب سے تھوڑا عرصہ پہلے تک اعلا لباس کا حصہ سمجھی جاتی تھیں۔

اب گھڑیاں جیبوں سے نکل کر کلائی پر آگئی ہیں یعنی اب وقت ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

وقت کیا ہاتھ آیا، طرح طرح کی گھڑیاں سامنے آگئیں۔ بغیر چابی کے چلنے والی، اندھیرے میں چمکنے والی، پانی سے خراب نہ ہونے والی اور چوٹ سہار جانے والی گھڑیاں اب عام ہیں۔ آج کی گھڑیاں دیکھنے میں سبک بھی نظر آتی ہیں، اور وقت کی پیمائش میں اتنی حساس ہیں کہ سکنڈ کے حصے کا بھی حساب رکھتی ہیں۔

دھوپ گھڑی سے لے کر کلائی کی گھڑی تک آتے میں بہت وقت لگا ہے۔

جہاں جہاں گھنٹی خود نہیں جاسکتی، وہاں اس کی آواز پہنچ جاتی ہے۔

گھنٹی کی آواز میں ایک آہنگ ہوتا ہے، جو بڑا شیریں ہوتا ہے اور سننے والوں کو بھلا معلوم ہوتا ہے لیکن گھنٹی موسیقی کا ساز نہیں ہے۔ وہ بجتی ہے تو اس کے بجنے میں کوئی نہ کوئی خبر ہے اور اس کی آواز میں بلاوا ہے۔ گھنٹی وقت گزرنے کی اطلاع دیتی ہے، مدت پوری ہو جانے پر خبردار کرتی ہے اور کہیں کہیں عبادت کے لیے بلاتی ہے۔ ٹیلی فون میں یا دروازے پر بج اٹھتی ہے تو کسی ملاقاتی کی خبر لاتی ہے۔ بعض جگہوں پر گھنٹی خطرے کی اطلاع دیتی ہے، اور آگ یا طوفان سے بچاؤ کے لیے خبردار کرتی ہے، مدد مانگتی ہے اونٹوں اور گائے بھینسوں کے گلے میں بندھی ہوتی ہے اور دن بھر چرنے کے بعد جانور شام پڑے اپنے گھر لوٹتے ہیں تو ان کے گلے میں بندھے بندھے بجتی ہے کہ جانور بھٹک جائیں تو گلے بان کو پتہ چل جائے کہ وہ کہاں ہیں۔ اس طرح گھنٹی ان کی خبر رکھتی ہے، اور جن کی خبر رکھی جائے وہ جانور حفاظت سے رہتے ہیں۔

گھنٹی کی آواز کہاں کہاں جاتی ہے اور کیا کیا کام کرتی ہے۔!

ابتدائی دور کے انسان نے گھنٹی نہیں بنائی۔ اسے گھنٹی کی زیادہ ضرورت بھی نہیں تھی۔ خبردار کرنے اور اطلاع دینے کا کام لوگ خود ہی پورا کر لیتے تھے۔ جب انسان نے غاروں سے نکل کر بستیوں میں رہنا شروع کیا اور الگ الگ بستیوں میں رہنے والے لوگوں میں اختلاف کی صورت پیدا ہوئی تو بستی والوں کو کسی بھی نئے آدمی کے بستی کی طرف آنے کی پہلے سے اطلاع ملنا ضروری ہو گیا۔ اور یوں گھنٹی کی ضرورت پڑی۔ شہروں اور قصبوں میں قلعے کے اونچے برج پر ایک آدمی کو بٹھا دیا جاتا، جو آنے والوں کو دور سے دیکھ لیتا اور وہیں سے نعرہ لگا کر بستی والوں کو خبردار کر دیتا۔ یوں بستی حملہ آوروں اور لٹیروں سے نمٹنے کے لیے تیار ہو جاتی۔ پھر برج پر، یا اونچے میناروں پر گھنٹیاں لگائی جانے لگیں تاکہ کسی بھی

اہم خبر کے لیے بستی والوں کو جمع کیا جا سکے۔

تاریخ کے صفحات میں کئی قدیم معاشروں میں گھنٹیوں کا ذکر ملتا ہے کہ گھنٹیاں لوگوں کی توجہ مبذول کرنے کے لیے یا کوئی اہم خبر سنانے کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ گھنٹی کا ذکر انجیل میں بھی آیا ہے۔ قدیم آشوریہ اور بابل میں سونے کی گھنٹیاں، گھوڑوں کے گلے میں باندھی جاتی تھیں اور ان گھنٹیوں کی آواز کا مطلب یہ تھا کہ شاہی رتھ آ رہا ہے۔ یہ آواز سُن کر لوگ راستہ چھوڑ دیتے اور مؤدب ہو جاتے۔ قدیم یونان میں قصبوں اور محلّوں کی حفاظت کے لیے چوکیدار موجود ہوتے۔ اور ایک چوکیدار سے دوسرے چوکیدار تک ایک گھنٹی گردش کرتی رہتی۔ ہر چوکیدار یہ گھنٹی اگلے تک پہنچا کر یہ ظاہر کرتا کہ وہ جاگ رہا ہے اور ہوشیار ہے۔ روم میں قاصد اور نقیب لڑکے گھنٹی بجا کر شہریوں کو کسی اہم اجلاس کے لیے یا حمّام کے کھلنے کی خبر دینے کے لیے جمع کرتے۔

کئی معاشروں میں گھنٹی کی آواز کا تعلق عبادت سے بھی رہا ہے۔ ازمنۂ وسطیٰ کے یورپ میں گرجا گھروں میں گھنٹیاں رواج پانے لگیں۔ گھنٹی بجا کر لوگوں کو عبادت کے لیے بلایا جاتا تھا۔ پھر ان گھنٹیوں سے شہری زندگی کے بعض اور اہم کام بھی لیے جانے لگے۔ گھنٹیاں بجا کر صبح دوپہر اور شام کا وقت بتایا جاتا، آگ لگنے کی اطلاع دی جاتی، رات کو سونے اور صبح کو اُٹھنے کے لیے خبردار کیا جاتا، گھنٹی بجا کر لوگوں کو ہوشیار ہونے اور ہتھیار اٹھا لینے کے احکام دیے جاتے اور گھنٹی کی آواز کے ذریعے کسی آنے والے خطرے یا اہم واقعے کی اطلاع دور دور تک پھیل جاتی۔ بعض علاقوں میں لوگوں کا یہ خیال تھا کہ گھنٹے کی آواز سے طوفانوں اور آنے والے خطروں کو دور بھگایا جا سکتا ہے اور بُرا اثر ڈالنے والی بدروحوں سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔

۱۳-۹
۸۰

مغل بادشاہوں کے عہد میں صبح اور شام کے وقت کا اعلان گھنٹہ سے وابستہ ہے۔ دلّی کے لال قلعے میں توپ دغنے سے اعلان ہوتا۔ رمضان میں سحری اور افطار کے وقت کا اور عید کا چاند نظر آنے کا اعلان توپ کی آواز سے ہوتا۔ اب یہ اعلان سائرن کی آواز سے ہوتا ہے جو برقی گھنٹی کی ایک شکل ہے۔

گھنٹی کا ایک انوکھا استعمال شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں ہوا۔ جہانگیر نے اپنے محل میں مشہور و معروف زنجیر عدل بنوائی ہوئی تھی۔ جس کسی کو شہنشاہ کے سامنے فریاد کرنی ہوتی، یا عدل وانصاف طلب کرنا ہوتا وہ زنجیر کھینچتا۔ یہ زنجیر ایک گھنٹی سے جڑی ہوئی تھی، جو زنجیر کھینچنے پر بج اُٹھتی اور گھنٹی کی آواز فریاد کو شہنشاہ تک لے جاتی، اور شہنشاہ کو خبر ہو جاتی کہ کوئی فریادی آیا ہے۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا، گھنٹی کا استعمال بڑھتا گیا اور مختلف نوعیت کے کاموں کے لیے اس سے فائدہ اٹھایا جانے لگا۔ انگلستان اور امریکہ میں گھنٹی کے ذریعے ملازم کو بلوایا جاتا۔ گھنٹی کی آواز سُن کر بچے اسکول جاتے، اور یہی آواز سن کر اسکول سے چھٹی کرتے۔ اسکول اور گھنٹی کا یہ ساتھ آج تک قائم ہے۔ سودا بیچنے والے اور اشتہار بانٹنے والے اپنی جانب توجہ مبذول کرانے کے لیے گھنٹی بجانے لگے۔ یہ رواج آج بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ جاڑے کی شاموں میں دہلی کے بعض محلّوں میں بھلستی ہوئی گرم گرم مونگ پھلیاں بیچنے والے گھنٹی بجا کر گھروں میں دُبکے ہوئے لوگوں کو بتاتے ہیں کہ مونگ پھلی کا ٹھیلا آرہا ہے۔ گھنٹی کی آواز کا مقصد خریدنے والوں کو خبر کرنا ہوتا ہے۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ یہ آواز سودے کے ذائقے میں شامل ہو گئی ہے اور گھنٹی کی آواز نہ ہو تو مونگ پھلیوں کا لطف آدھا رہ جائے۔

"ٹیلی فون کی گھنٹی اور دروازوں پر لگی ہوئی اطلاعی گھنٹی آج تک لوگوں کو بلانے اور اطلاع دینے کا فریضہ سرانجام دے رہی ہے۔

تالا اور چابی

تالے کا کام حفاظت ہے۔ زیور ہو یا نقدی، گھر بار ہو یا نقدی گھر بار ہو یا دفتر اور دکان لوگ اپنی قیمتی چیزیں بڑی خوشی سے اس کے پاس چھوڑ جاتے ہیں۔ تالا بند ہو کر ان کی نگرانی کرتا ہے۔ کسی غلط ہاتھ کو ان تک پہنچنے نہیں دیتا۔ یوں تالا محافظ بھی ہے اور رازدار بھی۔ تالا ایک بار بند ہو جائے تو خود بند ہونے کے ساتھ ساتھ جس چیز یا جگہ پر لگ جاتا ہے اسے بھی بند کر دیتا ہے۔ مگر تالے کا کام ادھورا ہے۔ ایک دفعہ بند ہو جائے تو اپنے آپ کھل نہیں سکتا۔ ہر تالے کو چابی کی ضرورت ہوتی ہے۔ چابی نہ ہو تو تالا کھلے کا کھلا اور بند کا بند رہ جائے۔

ابتدائی دور کے انسان کو اپنی چیزیں تالوں میں رکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ چیزیں بھی تھوڑی تھیں، اور ان کی ملکیت کسی ایک شخص تک محدود نہیں تھی، جو تھا وہ سب کے لیے تھا، کسی ایک کا نہ تھا۔ جب ملکیت کا تصوّر سامنے آیا تو پھر اس بات کی ضرورت بھی پڑنے لگی کہ چیزوں کو اس طرح رکھا جائے کہ وہ دوسروں کی پہنچ سے باہر رہیں۔

جب تالا اور چابی ایجاد نہ ہوئے تھے تو چیزوں کی حفاظت کے لیے لوگ ان کو چھپا کر رکھا کرتے تھے۔ گھاس پھوس میں اور درختوں کے کھوہ میں چیزوں کو رکھا جاتا تھا کہ کسی دوسرے کی نظر نہ پڑے، اور جس

جس میں انھیں وہاں رکھا ہے اس کا جب جی چاہے، آکر نکال لے۔ چیزوں کے ساتھ ساتھ اپنی حفاظت بھی ضروری تھی۔ اس دور کے لوگ جن غاروں میں رہتے تھے، ان غاروں کے دہانے پر بھاری پتھر رکھ لیتے تھے تاکہ جنگلی جانور اور دشمن اندر نہ آسکیں۔

جب لوگوں نے گھروں میں رہنا شروع کیا تو اپنی حفاظت کے لیے لکڑی کے شہتیر استعمال کرنے لگے۔ دروازے کی پشت پر شہتیر لگادیے جاتے تو وہ باہر سے کھل نہیں سکتا تھا۔ اس میں مشکل صرف اتنی تھی کہ یہ ترکیب اس وقت کام دیتی تھی جب آپ خود گھر کے اندر ہوں، باہر جاتے ہوئے دروازہ کھلا رہتا تھا۔

جلد ہی اس شہتیر کی جگہ لکڑی کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے نے لے لی۔ اور دروازے میں ایک چھوٹا سا سوراخ کر کے اس میں رسّی یا دھاگا ڈال دیا گیا جس کی مدد سے لکڑی کو آگے پیچھے کر کے کھولا یا بند کیا جا سکتا تھا۔ یہ کنڈی کی پہلی شکل تھی۔

اس اصول کے تحت لکڑی کے تالے قدیم مصر اور یونان میں عام استعمال ہوتے تھے۔ ان تالوں کو اس طرح بنایا جانے لگا کہ وہ چابی سے کھلیں اور بند ہو جائیں۔ جلد ہی لوگوں کو احساس ہو گیا کہ چابی کتنی اہم ہے اور کتنی بڑی علامت ہے۔ یونان میں لوگ بڑی بڑی چابیاں ساتھ لے کر گھوما کرتے تھے کہ دیکھنے والوں پر یہ تاثر پڑے کہ اس شخص کے پاس بہت مال و دولت ہے۔

دھات کا بنا ہوا تالا پہلی بار روم میں استعمال ہوا۔ روم کے بنے ہوئے تالوں میں چابی کے لیے سوراخ ہوتا اور چابی بھی دھات کی ہوتی۔ چابی کے دندانے اس طرح بنائے جاتے کہ تالے کے سوراخ میں برابر بیٹھیں تاکہ تالا صرف صحیح چابی سے ہی کھل سکے۔ اس طرح کے تالے اور چابیاں

آج تک استعمال میں ہیں۔

ادھر روم میں تو تالے لگ رہے تھے اور ان کے لیے چابیاں بنائی جارہی تھیں، لیکن دوسرے معاشروں میں چیزوں کی حفاظت کے لیے دوسرے طریقے رائج تھے۔

جان و مال کی حفاظت کے لیے وہ لوگ دوسرے طریقے اختیار کرتے۔ بعض لوگ اپنے گھر ایسی جگہوں پر بناتے کہ وہاں تک پہنچنا آسان نہیں تھا۔

امریکہ کے پاہلو انڈین باشندے چٹانوں پر رہتے تھے اور ان مکانوں میں داخلے کا واحد راستہ سیڑھی کے ذریعے سے تھا۔ رات کے وقت اس سیڑھی کو اوپر کھینچ لیا جاتا۔ یوں سمجھیے کہ اب پوری بستی کو تالا لگ گیا۔ ان کے برخلاف قدیم میکسیکو کے آزٹیک باشندوں کا دستور نرالا تھا۔ ان کے گھروں میں دروازے نہیں ہوتے تھے اور وہ کہیں جاتے ہوئے ایک چھڑی باہر رکھ جاتے تاکہ آنے والوں کو پتہ چل جائے کہ وہ گھر پر نہیں ہیں۔ اس چھڑی کا مقصد حفاظت نہیں تھا بلکہ اطلاع دینا تھا۔

ایک صوفی بزرگ کے بارے میں روایت بیان کی جاتی ہے کہ گھر سے باہر کہیں جاتے تو دروازے کھلے چھوڑ جاتے اور اندر ہوتے تو دروازے میں تالا لگا لیتے۔ لوگوں نے ان سے اس کا سبب پوچھا۔ انھوں نے جواب دیا کہ اس گھر میں سب سے قیمتی چیز تو میں خود ہوں۔ میرا علمی اثاثہ ہے جسے چوروں سے بچانا ضروری ہے۔ اگر میں موجود نہیں ہوں، تو جو گھر میں داخل ہو گا تو اسے کچھ ملے گا ہی نہیں کہ چرا سکے۔

ازمنۂ وسطیٰ کے یورپ میں لوگوں کو اپنے گھر بار اور سازوسامان کی حفاظت کی بہت ضرورت رہتی۔ شہر قلعہ بند تھے اور قلعوں کے گرد

فصیلیں تھیں۔ رات کے وقت فصیل کے پھاٹک بند کر کے ان میں بھاری قفل لگا دیے جاتے۔ ان تالوں کی چابیاں صرف بہت خاص اور اہم لوگوں کے پاس رہتی تھیں۔ آج شہروں میں نہ فصیلیں ہیں نہ شہر کے دروازے لیکن یہ دستور باقی ہے کہ باہر سے آنے والے کسی مہمان کی عزّت افزائی کے لیے اسے شہر کے دروازے کی چابی پیش کی جاتی ہے۔

جوں جوں زمانہ ترقی کرتا گیا تالے بہتر سے بہتر اور مشکل سے مشکل ہوتے گئے۔ لوگ اپنی قیمتی چیزوں کی حفاظت کے لیے طرح طرح کی ترکیبیں استعمال کرنے لگے۔ قدیم مصر کے فرعون، جس اہرام میں دفن ہوتے تھے اس میں اپنی دولت کی عزّت کے لیے ایسے طریقے استعمال کرتے تھے کہ لٹیرے اس تک نہ پہنچ سکیں۔ عمارت میں بھول بھلّیاں، خفیہ راستے اور چور دروازے بنائے جاتے تھے۔ ازمنۂ وسطیٰ کے یورپ میں محل اور قلعے اس طرح تعمیر کیے جاتے کہ ان میں چھپنے اور چھپانے کی ایسی جگہیں موجود ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ تالوں کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ بعض تالے ایسے تھے جو ایک خفیہ گھنڈی کو دبانے سے کھلتے اور ایسے تالے بھی تھے جو زہر میں بجھے ہوئے ہوتے کہ کسی غلط آدمی کا ہاتھ لگ جائے تو اس کا زہر چڑھ جائے۔ آہن گر بڑی مہارت سے نت نئے قسم کے تالے بناتے۔ یوں بھی تالے بنانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ لیکن جتنی مہارت سے وہ تالا تیار کرتے، اتنی ہی مہارت سے کوئی نہ کوئی ہشیار آدمی اس تالے کا توڑ بھی بنا لیتا۔ یوں نت نئے اور مضبوط سے مضبوط تر تالوں کی ضرورت بڑھتی رہتی۔

تجوریوں اور صندوقوں میں ڈالے جانے والے موٹے قفل سے لے کر چھوٹے تالوں تک، ہزاروں طرح کے تالے لگائے جا چکے ہیں۔ تالے بنانے میں آج کے دور میں جو سب سے اہم پیش رفت ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ

بینک یا عجائب گھر میں سیف پر جس قسم کے تالے لگائے جاتے ہیں وہ ایک خاص نمبر یا ابجد پر ہاتھ لگانے سے کھلتے ہیں۔ اگر آپ نے صحیح ہندسے نہیں گھمائے۔ تو قفل نہیں کھلے گا۔ ان تالوں میں تالے کی جگہ ابجد نے لے لی ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں ایسے تالے بھی بنتے تھے جن پر حروف لکھے ہوئے ہوتے۔ ان کو قفل ابجد کہا جاتا تھا۔ ان حروف کو دبانے یا گھمانے سے تالا کھل جاتا تھا۔ مثلاً اگر قفل ابجد کے نام سے کھلنے والا ہے تو نام کے مجموعے سے قفل کھل جائے گا۔

ابجد کے حروف سے کھلنے والے اس قفل کا تصوّر بھی کتنا حیران کن ہے ایسا لگتا ہے کہ یہ کائنات بھی ایک طرح کا قفل ہے اور حروف ابجد سے اس کا سربستہ راز بھی ایک نہ ایک دن کھل جائے گا۔

آئینہ

چیزوں کی کہانی میں سب سے عجیب کہانی اس چیز کی ہے جس کی طرف دیکھتے ہوئے کوئی اس چیز کو نہیں دیکھتا بلکہ اپنے آپ کو دیکھتا ہے۔ یہ آئینہ ہے کہ جو اس کے سامنے آتا ہے وہ سب کے سامنے کر دیتا ہے۔ خود نہ کچھ کہتا ہے نہ کرتا ہے۔ اس میں جھانکنے والا جو کہے یا کرے، اسی کو دہرا دیتا ہے۔ آئینہ بلا کا سچّا ہے۔ لگی لپٹی نہیں رکھتا، کسی کا لحاظ نہیں کرتا۔ جو اس کو دیکھتا ہے، مُنہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔

حضرت امیر خسروؒ سے جو پہیلیاں اور دو سخنے منسوب ہیں، ان میں سے ایک یوں ہے۔

فارسی بولی آئینہ
ترکی بولی پائی نہ

ہندی بولی آرسی آئے
مُنہ دیکھے جو اسے بتائے

اس کا جواب ہے آئینہ۔ جس نے اسے بوجھ لیا اس نے آئینہ دیکھا اور آئینہ کیا دیکھا، اپنا مُنہ دیکھ لیا۔ مگر آئینے صرف منہ دیکھنے کے نہیں ہوتے، ان کے اور بھی بہت سے استعمال ہیں، اور آئینے کی کہانی صدی پرانی ہے۔

آج تو ہم سب آئینے سے واقف ہیں، مگر جب ابتدائی دور کے انسان کا پہلی بار آئینے سے تصادم ہوا ہو گا تو اسے بہت عجیب لگا ہو گا۔ شاید وہ سمجھا ہو گا کہ کوئی اس کا مُنہ چڑا رہا ہے۔ اسے بھلا کون بتاتا کہ آئینے میں اس کا عکس ہے، کوئی اس کی نقل نہیں کر رہا۔

انسان کے لیے پہلا آئینہ ٹھہرا ہوا پانی بنا ہو گا۔ جنگل میں چلتے چلتے وہ پیاس بجھانے کے لیے پانی پر جھکا ہو گا اور پانی کی سطح پر ایک چہرہ تیرتا ہوا دیکھ کر ٹھٹھک گیا ہو گا۔ اس اجنبی کو اپنے پانی سے بچانے کے لیے شاید اس نے کنکری ماری ہو گی۔ کنکری مارنے سے پانی پر ارتعاش ہوا ہو گا اور وہ چہرہ بھنور کی لہروں کے ساتھ دور تک بہتا چلا گیا ہو گا وہ اس چہرے کو دیکھ کر ڈر گیا ہو گا، اور اسے جادو کا اثر سمجھا ہو گا۔

پانی میں عکس تو بنتا ہے، آئینہ نہیں بنتا۔ پہلے پہل آئینے دھات سے بنے۔ انسان کو یہ معلوم ہوا کہ صیقل کی ہوئی دھات میں بھی اس کی شکل نظر آتی ہے۔ جب اس نے اپنی شکل و صورت پر توجہ دینی شروع کی تو اپنا مُنہ دیکھنے کے لیے دھات کے آئینے بنائے۔

"آئینہ" فارسی لفظ ہے۔ محقق حضرات کہتے ہیں کہ یہ لفظ اصل میں "آہینہ" تھا، "آہن" سے نکلا ہوا۔ آہن فارسی میں لوہے کو کہتے ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آئینہ لوہے سے نکلا ہے۔ لوہے کو اتنا صاف کیا گیا کہ اس میں شکل دکھائی دینے لگی۔ یہ آئینہ بن گیا۔ اسی وجہ سے فارسی اور اردو شاعری میں آئینے میں جوہر تلاش کیا جاتا ہے۔ روایت ہے کہ لوہے کا یہ آئینہ یونان کے بادشاہ اسکندر اعظم نے بنایا۔ ہماری شاعری میں اسی لیے اسکندر اعظم سے وابستہ ہے۔

تاریخ سے یہ ثابت تو نہیں ہوتا کہ آئینہ اسکندر اعظم کی ایجاد ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ آئینے بہت قیمتی سمجھے جاتے تھے اور پرانے زمانے کے بادشاہ اور ملکہ اپنے پاس رکھتے تھے۔ انتہائی چمک دار سونے اور چاندی کے ایسے آئینے ملتے تھے جن کے ساتھ دستہ ہوتا اور جو آگے پیچھے گھمائے جا سکتے تھے۔ جب اپنا چہرہ دیکھتے دیکھتے دل بھر جائے، تو آئینے کو پلٹ لیجیے اور اس کی پشت پر بنے ہوئے نقش و نگار کو سراہیے۔

سونے چاندی کے آئینے میں منہ دیکھنا تو ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ تانبہ اور کانسی کے سستے آئینے عام تھے۔ قدیم روم میں ان کا استعمال بہت عام تھا۔ روم کے حمّام آئینہ دکھانے اور آئینے کو صاف رکھنے کے لیے الگ سے غلام رکھتے تھے۔ آئینے کے ان غلاموں کا کام ہی آئینے پر پالش کرنا تھا۔

آئینے سے منہ دیکھنے کے علاوہ اور کام لینے کا سلسلہ زمانۂ قدیم سے شروع ہو چکا تھا۔ یونان میں آئینے کے ذریعے آگ جلانے کا کام بھی ہوتا تھا۔ ان آئینوں کو "عدسے" کہا جاتا تھا اور ان سے سورج کی شعاعیں ایک جگہ مرتکز کر کے آگ لگائی جا سکتی تھی۔ قدیم مصر میں ساحلوں کے محافظ ساحل کے پاس اونچی جگہوں پر مینار تعمیر کر کے

ان پر آئینے نصب کر دیتے تھے۔ اور ان آئینوں کے ذریعے آتی جاتی کشتیوں اور جہازوں کی نگرانی کرتے۔

دھات کے آئینوں کا رواج ازمنۂ وسطیٰ کے یورپ میں بھی رہا۔ دھات کے چھوٹے چھوٹے خوب صورت آئینے، خواتین اپنی کمر کے گرد باندھتی تھیں گول آئینے کمروں میں لگائے جاتے، کیوں کہ ان میں پورا کمرہ نظر آتا تھا۔

جن علاقوں میں دھات کا استعمال عام نہیں ہوا تھا، وہاں سلیٹ پر پالش کرنے سے آئینہ بنایا گیا۔ بعض علاقوں میں سیاہ رنگ کے آتش فشاں مادّے اور چمکا کر آئینے کا کام لیا گیا۔ عجیب بات ہے کہ یہ آئینے سیاہ تھے۔

آئینے میں اجالا اس وقت ہوا جب ۱۳۰۰ء کے لگ بھگ اطالیہ کے شہر وینس میں شیشے سے آئینہ بنانے کا طریقہ دریافت ہوا۔

وینس اس وقت تجارت کا بہت بڑا مرکز تھا، اور صنعت و فن کے بڑے بڑے باکمال یہاں موجود تھے۔ یہاں کسی ہنر مند کاری گر نے دریافت کیا کہ جست اور پارے کا مرکّب شیشے کے اوپر لگا دیا جائے تو اس میں زیادہ بہتر عکس بنتا ہے اور روشنی اس میں چمکتی ہے۔ یہ آئینہ گری کی ابتدا تھی۔ اس کے بعد سے آئینے شیشے کے ہونے لگے۔

آئینہ، شیشے سے بننے تو لگا، مگر بے حد مہنگا ہوتا تھا۔ امراء اور رؤسا کے گھروں میں یہ قیمتی آئینے، آرائش اور زیبائش کے لیے لگائے جاتے تھے۔ یہ آئینے بہت چھوٹے ہوتے تھے اور جڑاؤ فریم میں نصب کیے جاتے تھے۔ جیسے یہ کسی ماہر مصوّر کی بنائی ہوئی تصویر ہوں۔ آئینے کو بے حد قیمتی سمجھا جاتا تھا اور آئینہ ساز اس کے بنانے کی ترکیب کو راز بنا کر رکھے ہوئے تھے۔

سترھویں صدی میں آئینہ سازوں نے بڑے بڑے آئینے بنانے

کا طریقہ دریافت کرلیا۔ اب وہ آئینے کی پوری پوری چادر بنانے لگے۔ اب قدِ آدم آئینے کا رواج ہوگیا۔ یورپ کے شہزادے ”آئینہ بند کمرے“ تعمیر کروانے لگے جن کی دیواروں پر آئینے نصب ہوتے تھے، اور وہ ان کمروں میں کھانے دیتے اور رقص کرتے ہوئے اپنے آپ کو دیکھ دیکھ کر سراہ سکتے تھے۔ اب آئینہ خود بینی اور خود نمائی کا ذریعہ بن گیا۔

کہا جاتا ہے کہ شہزادی زیب النساء کے پاس ایک بہت قیمتی آئینہ تھا جو چین سے آیا تھا۔ کسی کنیز سے وہ اتفاقاً گر کر ٹوٹ گیا۔ کنیز کو خوف ہوا کہ شہزادی آئینہ ٹوٹنے کی سزا دیں گی، مگر ان کو اطلاع دینا ضروری تھا۔ کنیز نے شہزادی کے سامنے جاکر مصرعہ پڑھا:

؎ از قضا آئینۂ چینی شکست

یعنی بہت افسوس کہ آئینۂ چینی ٹوٹ گیا۔

شہزادی نے مصرع پر مصرعہ لگایا:

؎ خوب شد سامان خود بینی شکست

یعنی اچھا ہوا کہ اپنے آپ کو دیکھتے رہنے کا سامان ٹوٹ گیا۔

یہ سامانِ خود بینی دیر تک ساتھ رہا۔ مغل شہنشاہوں نے شیش محل تعمیر کروائے۔ آگرہ کے قلعے میں ایک شیش محل بنوایا گیا تھا، جس میں قیمتی شیشے کے ٹکڑوں کو تراش کر کاریگروں نے چھت اور دیواروں پر نقش و نگار بنائے تھے۔ صباح الدین عبدالرحمٰن کا بیان ہے کہ اب بھی جب کہ یہ محل بالکل خستہ ہوچکا ہے، اس میں روشنی کی جاتی ہے تو لاکھوں تارے چمکتے نظر آتے ہیں۔“ شیش محل کے پاس ایک حمام بنا ہوا ہے۔ حمام سے شاہی بیگمات سنگھار کے لیے شیش محل میں آجاتی تھیں اور وہاں شیشے کے سیکڑوں ٹکڑے اس زاویے سے لگے ہوئے تھے کہ ہر ٹکڑے میں پورا عکس آجاتا۔ کہا جاتا ہے کہ جب ملکہ ممتاز محل سنگھار کے لیے اس محل میں آئی

نوشاہ جہاں کو ایک وقت میں سیکڑوں ممتاز محل نظر آتی تھیں۔ اپنی اسی محبوب ملکہ کی یاد میں شاہ جہاں نے تاج محل تعمیر کروایا، اور جب اسے تخت سے معزول کر کے آگرے کے اسی قلعے میں قید کر دیا گیا تو اس نے اپنے کمرے میں ایک چھوٹا سا آئینہ لگوا لیا تھا جس میں پورا تاج محل سمٹا ہوا نظر آتا تھا۔ آئینے کا یہ عکس، معزول اور مجبور شہنشاہ کے لیے بہت بڑا سہارا تھا۔

خود بینی کے بعد خود آگاہی کا مشکل مرحلہ آتا ہے۔ طلسم ہوش ربا کی دلچسپ اور حیرت انگیز داستان میں طلسماتی حجرۂ بلا کا ذکر ہے۔ طلسم نورافشاں کا حجرۂ بلا اس قدر حسین وجمیل تھا کہ جو اس کو دیکھتا اس کا گرویدہ ہو جاتا اور اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالتا۔ یوں پورا لشکر تباہ ہوا جا رہا تھا۔ عیّاروں نے عیّاری دکھائی اور تمام لباس پر آئینے سجا کر یعنی آئینہ پوش سوار بن کر اس کے سامنے گئے۔ وہ آئینے میں اپنی شکل دیکھ کر اپنا ہی گرفتار ہو گیا۔ اور اپنے آپ کو تباہ کر لیا۔ یوں افراسیاب کے لشکر کی جان بچ گئی۔ وہ بلا کا شہزادہ آئینے میں نظر بند ہوا اور آئینے دیکھنے کے سبب ہلاک ہوا۔

اسی لیے تو غالب نے کہا تھا کہ ڈرتا ہوں آئینے سے ... مگر آئینے کا کام صرف عکس تک محدود نہیں۔ دوربین میں نصب کیے جانے والے آئینوں نے آسمانوں کے اسرار انسان کی آنکھ پر کھول دیے ہیں۔ آئینہ عکس نہ دکھاتا تو خوردبین بھی کام نہ کرتی۔ خوردبین کے ذریعے جراثیم کو نظر میں لا کر ان کی پیدا کردہ بیماری سے جنگ لڑنا ممکن ہوا، اور مادّے کے اندر جھانک کر جوہر اور اس کی بے پایاں توانائی کو دریافت کیا گیا۔ ان ہی عدسوں کو جوڑ کر عینک بنائی گئی جس نے دھندلی نظر کو صاف کیا۔ گاڑی میں شیشے لگائے گئے جو دور تک آنے والی

گاڑیوں کو سامنے رکھتے ہیں! سفر کو محفوظ بناتے ہیں۔ اگر غور سے دیکھیے تو آئینہ بڑے کام کی چیز ہے۔ ہمیں عجائبات کی دنیا ستان والی ایلس کی طرح آئینے کے پار جانے کی ضرورت نہیں۔ آئینہ خود کیا کم دلچسپ اور عجیب ہے۔

آنے والی چیزیں

چیزوں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ہم بتّی سے لے کر آئینے تک پہنچے۔ بتّی نے اندھیروں کو دور کیا اور دنیا کے کونے کونے کو انسان کے لیے روشن کر دیا۔ یوں انسان نے اپنا چہرہ پہچاننا سیکھا۔ آئینے سے خود اس کے اپنے خدوخال اس پر واضح ہوئے۔ انسان نے اپنا چہرہ دیکھا۔ خود کو پہچاننا سیکھا اور سوال کیا کہ میں کون ہوں؟ بتّی سے لے کر آئینے تک کتنی چیزیں درمیان آئیں اور ابھی ختم نہیں ہوئیں۔ چیزوں کا سفر جاری ہے۔

آج ہم چیزوں سے، اور چیزوں کی جن شکلوں سے بہت مانوس ہیں وہ بدل جاتی ہیں اور رفتہ رفتہ اتنی پُرانی ہو جاتی ہیں کہ عہد گزشتہ کا حصّہ بن جاتی ہیں۔ پرانے زمانے کے کپڑے اور کھانے کی چیزیں جن کا پچھلے صفحات میں ذکر ہوا، اپنے زمانے کے لوگوں کی روزمرّہ زندگی کے معمولات کا حصّہ ہوں گی حالانکہ آج ہمیں بیکار اور نامانوس معلوم ہوتی ہیں۔ اسی طرح ہم چیزوں کو آج برت رہے ہیں اپنا وقت پورا کرنے پر وہ بھی بے مصرف ہو جائیں گی۔ ان کی جگہ نئی نئی چیزیں لے لیں گی۔ یہ آنے والی چیزیں کیسی ہوں گی ہمیں صرف اس کا اندازہ ہے۔

مثلاً چولھے کا حال دیکھیے۔ انسان نے بڑے جتن کے بعد آگ جلائی، کچّے پکّے چولھے بنائے۔ لکڑی سے جلنے والے چولھے کی جگہ مٹّی کے تیل کے چولھے نے لے لی، اور پھر وہ بھی پرانا ہوگیا اس لیے کہ گیس کے چولھے عام ہو گئے۔ آج کل MICRO WAVE چولھے نئے ہیں۔ جلد ہی وہ وقت بھی آسکتا ہے کہ یہ گھر گھر عام ہو جائیں۔ یا شاید شمسی توانائی سے چلنے والے چولھے ان سب کی جگہ لے لیں۔ پھر دھوپ کا مزہ ہمارے کھانوں میں شامل ہو جائے!

انسان جوں جوں دنیا کو تسخیر کرتا جاتا ہے، اپنی سہولت کے لیے نت نئی چیزیں بناتا جاتا ہے اور پرانی چیزوں کو نئی شکلیں دیتا جاتا ہے۔ تھوڑی سی چیزوں کا ذکر تو آپ نے اس کتاب میں پڑھا، لیکن ابھی اور بہت سی چیزیں ہیں جو ہم آنے والے دنوں میں دیکھیں گے۔

تمام کتابیں بغیر مالی فائدے کے پی ڈی ایف کی جاتی ہیں۔ مصنف سے ہمارا متفق ہونا ضروری نہیں۔

سید حسین احسن۔
فیس بک گروپ
کتابیں پڑھیے۔
03146951212
03448183736